اورحان کمال

بیکار کے مہ وسال (ناول)

دیباچہ، نوبل انعام یافتہ ادیب اورحان پاموک

مترجم: خالد فتح محمد

اورحان کمال

(ترکی کے معروف ادیب)

بیکار کے مہ و سال

(ناول)

مترجم: خالد فتح محمد

جمہوری پبلیکیشنز

(I)

یورگی نے اپنی کزن کے ساتھ شادی کرنے کے بعد چھان بورے کی دکان بند کر دی
[illegible] کے بعد ہماری فٹ بال ٹیم ٹوٹ گئی۔ غازی اور میں کسی دوسرے کلب میں شامل ہو گئے اور
[illegible] بات تھی کہ ہم حسن حسین کو بھی ساتھ لے گئے۔

میں پینلٹی لگانے میں ماہر تھا جب کہ غازی سر کے ذریعے حیرت کن گول بنا تا تھا۔ اگر
[illegible] معاملے کا فٹ بال کے ساتھ واسطہ نہ ہوتا تو ہمیں اس سے کوئی سرکار نہیں تھا......! لیکن حسن
[illegible] اپنے پرانے، گھسے ہوئے کوٹ کے اندر خستہ حالی کا نمونہ بنے ایک ہٹ دھرمی کے ساتھ
[illegible] کے ساتھ رشتہ جوڑے ہوئے تھا تا کہ وہ ایک دِن اکاؤنٹنٹ بن کر بھیڑ کے گوشت کے
[illegible] خریدنے کا اہل ہو سکے۔

ہم ''کریٹن'' نامی ایک کیفے میں بیٹھتے تھے۔

کیفے، سفیدے کے اونچے درختوں میں واقع تھا۔ یہ ایک مستطیل شکل کی عمارت تھی
[illegible] دیواروں میں کھڑکیوں کی قطار تھی۔ کیفے شہر کے مرکز سے کافی دور تھا۔ معتبر مرد حضرات جو
[illegible] ہنگاموں سے اکتا کر یہاں آتے، سفیدے کے درختوں کے نیچے اپنی کرسیاں رکھ کر
[illegible] کے ساتھ اپنے معاملات پر غور و خوض کرتے، خاص کر ان دنوں میں جب موسم اچھا ہوتا۔

کیفے کا مالک کریٹ کا رہنے والا تھا۔ گو وہ عمر میں ہم سے بہت بڑا تھا لیکن وہ ایک زندہ
[illegible] بال رکھنے والا مہمان دار تھا۔ وہ ایک بوجھل سے لہجے میں ترک زبان میں بات چیت کرتا،

اور نسبتاً کم تر حیثیت کے گاہکوں کو چرس بیچتا۔ میں ہر صبح، یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ سکول جا رہا ہوں، گھر سے نکلتا، کتابیں بغل میں دبائے اور سکول کی پیلی لکیروں والی ٹوپی سر پر پہنے، میں کریٹن کا رخ کرتا۔ میں غازی اور حسن حسین کا چوک پر انتظار کرتا۔ اگر وہ پہلے پہنچ جاتے تو دیر سے آنے کی وجہ سے لازماً میری کھچائی کی جاتی۔ وُہ کچھ دیر میرا مذاق اڑاتے، پھر ہم قہقہے لگاتے ہوئے اور آپس میں باتیں کرتے ہوئے، بے دھیانی میں آوارہ کتوں پر پتھر پھینکتے، سڑک پر گزرتی چمکتی ہوئی ٹیکسیوں کی تعریف کرتے ہوئے، کیفے کی طرف آہستہ آہستہ چلتے جاتے۔ مالک ابھی تک بستر میں خراٹے لے رہا ہوتا۔ مبادا کہ وہ جاگ جائے، ہم چپکے سے اندر داخل ہو کر چولہا جلاتے اور چائے بنانے کے لیے کیتلی اس کے اوپر رکھتے اور اگلے دروازے والے کریانہ فروش سے خول والے اخروٹ اور تازہ روٹی لے آتے۔

کریٹن آنکھ کھلنے کے بعد جب دیکھتا کہ کام ہو رہا ہے تو کہتا۔ ''شاباش، لڑکو، تمہاری یہ ہی اچھی بات ہے۔''

کبھی کبھار وہ ناقابلِ یقین خبر سناتا۔ مثال کے طور پر:

''میں ابھی سونے کی تیاری کر رہا تھا۔'' وہ کہتا۔ ''ایک کار آ کر رکی۔ چار پانچ لوگ باہر نکلے اور اُس طرف اندر چلے جاتے، پھر کار چلتی بنی۔''

اِس خبر پر ہم خوف زدہ ہو گئے۔ اگر وہ لوگ شادیاں کرنے آئے ہوتے تو ہم کیا کر سکتے تھے؟ اگر لڑکیوں کے باپ نے ہاں کہہ دی، تو؟

بات ایسے ہے کہ سرخ اینٹوں والے گھر کی لڑکیوں کے ساتھ ہمارے تعلق بن گئے تھے۔ گھر کیفے کے رُخ میں گندم کے کھیت میں واقع تھا۔ اُس گھر میں تین لڑکیاں رہتی تھیں، سب سے بڑی کیفے کے مالک کے ساتھ گھومتی پھرتی، درمیان والی میری تھی اور سب سے چھوٹی غازی کے ساتھ باہر جاتی۔ حسن حسین کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ حسن حسین بہترین کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک دولت مند یا مشہور خاندان کی لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔

اگرچہ وہ اپنے آپ کو بچا رہا تھا، اور عارضی سطح پر ہی سہی، اس کا ایک محبوبہ رکھنے کا کوئی

ارادہ نہیں تھا، حسن حسین سکول سے بھاگ جاتا تا کہ ہمارے ساتھ رہ سکے۔ اُن دنوں میں جب ہم ان لوگوں کو پیٹا کرتے جو ہمارے دوستوں کے متعلق نامناسب رائے دیتے تو وہ (حسن حسین) سب سے پہلے اِس مار پیٹ میں کود پڑتا اور سب سے زیادہ زور سے مارتا۔ ہوا زدہ راستوں میں جب بوڑھے مصری توت کے نیچے ہمیں گھنٹوں لڑکیوں کا انتظار کرنا پڑتا، وُہ ہمارے ساتھ ہوتا۔ اُس نے کبھی نہیں پوچھا تھا: ''میں یہاں کیا کر رہا ہوں؟ میرا اِس کے ساتھ کیا واسطہ ہے؟'' اُن گھنٹوں میں جب ہم ایک دوسرے سے جدا ہو کر مختلف درختوں کے نیچے پناہ لیے ہوتے اور صرف پیار اور مباشرت کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہوتے، وہ بیس میٹر دور مالٹوں کے جھنڈ میں، سگریٹ پیتے، وقفے وقفے سے کھانستے، ایک توازن کے ساتھ اوپر نیچے چکر لگاتا رہتا اور کبھی کبھار عینک اتار کر شیشوں کو رومال سے صاف کرتا۔

میری دوست اِس بارے میں اکثر سوچتی!

''صابر اور وفادار، ہے کہ نہیں؟''

''کیا مطلب؟ کیوں کہ وہ انتظار کر رہا ہے؟''

''ہاں! کیوں کہ وہ وہاں انتظار کر رہا ہے۔ اِس لیے بھی کہ وُہ اپنی کوئی دوست نہیں بنا رہا......''

ہم سال خوردہ مصری توت کے نیچے سے ماچس کی تیلی جلا کر لڑکیوں کو اشارہ دیتے اور پھر کھڑکی کے ساتھ رکھے صوفے پر سے اُن کے اشارے کا بے چینی کے ساتھ انتظار کرتے، جو لالٹین کو استعمال کر کے دیا جاتا۔ بعض اوقات انتظار میں زمانے گزر جاتے۔ پھر گیلی رات میں جب ہم درختوں کے نیچے کھڑے ہوتے، آسمان گرج رہے ہوتے، بجلی چمک رہی ہوتی اور ہمارے گرد تیز ہوا خشک ٹہنیوں پر چیخ رہی ہوتی، اندھیرے میں سے ٹمٹماتی ہوئی بے چین روحوں کی طرح ظہور پذیر ہو کر لڑکیاں آخر کار ہماری طرف بھاگتی ہوئی آتیں۔ میرے والی بے چینی سے بار بار اپنے ہاتھ ملتی، پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ لیتی اور اسے اپنے سینے کے ساتھ لگاتی۔

''دیکھو، میرے دل کی دھڑکن سنو! اگر میں کسی دن مر گئی تو یہ تمہارا قصور ہو گا۔''

دوسری لڑکیوں میں سے کوئی بھی اُسے سن سکتی تھی۔ ''ہم جو کچھ ان کے لیے کرتی ہیں،

اگر وہ صرف اُسے سراہ سکیں۔'' وہ سرگوشی کرتی۔

ایک رات جب وہ اپنے باپ کو سلانے میں کامیاب ہوگئیں، ماں کو بتایا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے ہمسایوں کے گھر جا رہی ہیں، اور جب وہ پنجوں کے بل سیڑھیاں اُتر رہی تھیں تو اُن میں سے ایک کا پاؤں بلی کے اوپر آ گیا۔ بلی کی چیخ کی وجہ سے بڈھے نے بستر سے چھلانگ لگا دی۔ اُس رات ہمارا تمام بندوبست دھرے کا دھرا رہ گیا۔

جب وُہ ہمارے پاس آ جاتیں تو ہم میں سے ہر کوئی اپنی محبوبہ کا ہاتھ پکڑ کر گیلی اور پھسلن والی زمین پر مختلف سمت میں لے جاتا جب کہ حسن حسین پیچھے رہ جاتا اور سگریٹ سلگا کر بیٹھی ہوئی آواز سے کھانستا رہتا۔

ایک دن ہم نے ایک نیا دوست بنایا۔ ہمارے نئے دوست کی آنکھیں سیاہ تھیں اور سفید مرجھایا ہوا چہرہ۔ وہ ہمیشہ بلند آواز میں ہمیں ہنساتا اور تختۂ نرد میں ایک پوائنٹ ہارے بغیر ہمیں لگاتار ہراتا۔ نجیب استنبول کا رہنے والا تھا اور وہاں اپنی فوجی ملازمت کے لیے آیا تھا۔ نجیب کو فوجی ملازمت سے فراغت کے کاغذات جلد ہی موصول ہونے والے تھے اور وُہ ہمیں استنبول کے بارے میں بتاتے کبھی نہ تھکتا۔ اُس کی شاندار تصویر کشی میرے بچپن کی یادوں پر اثر انداز ہوتی جس کی وجہ سے استنبول ایک چمکتا ہوا، رہ نظر آتا، مقابلے میں میرا اپنا شہر بے نور لگتا۔

''یہاں۔'' وہ کہتا ''تمھارے اندر دنیا کا اعلیٰ ترین جوہر ہوسکتا ہے لیکن تم کچھ بھی حاصل نہیں کر سکو گے۔ تمھیں استنبول جانا چاہیے تاکہ دیکھ سکو کہ شہر کیا ہوتا ہے؟ علی نامی ایک آدمی تھا جو سنوپ کا رہنے والا تھا۔ جب اُس نے فٹ بال کھیلنا شروع کیا تو وہ اتنا اچھا نہیں تھا جتنا کہ تم لوگ ہو۔ اب وہ فینر باہیش میں ان سائیڈ لیفٹ کھیلتا ہے۔''

ایک دن غازی نے کہا۔ ''تم کیا کہتے ہو؟ ہم ابھی اٹھیں اور چل پڑیں۔''

''ہماری دوستوں کا کیا بنے گا؟''

''اُن کی فکر مت کرو۔ استنبول میں لڑکیوں کی کمی نہیں۔''

''میرے سکول کا کیا بنے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''سکول کا کیا ہے؟''

''تم جانتے ہو......''

غازی متذبذب سا لگا۔

''تم اِس طرح کیوں لگ رہے ہو، غازی؟''

''جیسے تم سکول جا رہے ہو......''

''ٹھیک......وہاں پہنچنے کے لیے کرایہ کہاں سے آئے گا؟''

'وہاں پہنچنا......یہ اصل بات ہے۔ فرض کرو ہم نے کسی طرح میرسن سے سفر کے پاس حاصل کر لیے......''

''ہم راستے میں کھائیں گے کیا؟ فرض کر لیا کہ ہم استنبول پہنچ گئے؟ ہم ٹھہریں گے کہاں؟ اور کھائیں گے کہاں سے؟''

''ٹھہرو!'' غازی نے کہا۔ ''ہم رشاط اور احمد کو ڈھونڈ لیں۔ وہ ہمیں کھڈی چلانا سکھا دیں گے۔ ہم کپڑے کے کارخانے میں تھوڑا عرصہ کام کر کے کچھ بچا سکتے ہیں......''

''درست، پھر ہم وہاں جا سکتے ہیں۔ استنبول میں، پارچہ بافی قابل قدر تجارت ہوگی۔ اگر ہمیں کبھی پیسے کی کمی ہوئی......''

''اگر کبھی کمی ہوئی، جو بھی کام ملا ہم کر لیں گے......''

''ہم یقیناً کریں گے۔ حسن حسین یقیناً اپنے ہاتھ گندے نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن......''

''حسن حسین کے متعلق مت سوچو۔ یاد رکھو کہ نجیب نے کیا کہا؟ سنوپ کے رہائشی علی کے بارے میں جو تمباکو والوں کے ہاں کام کرتا تھا؟ یاد رکھو؟ کون بتا سکتا ہے کہ ہم کیا کریں گے؟''

''شاید......شاید......اگر ہمیں مناسب تربیت مل جائے۔ لیکن ہمیں حسن حسین کو نہیں بتانا چاہیے......اگر ہم فینر باہیش کو نظر میں رکھیں تو ہم آخرِ کار قومی ٹیم میں آ جائیں گے۔''

''کیوں نہیں؟ یہ ممکن ہے۔''

اب ہماری تمام گفتگو استنبول پر مرکوز ہوگئی۔

ہم نے کارخانے میں کام شروع کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

بعد میں ہم نے اپنی دوستوں کو استنبول جانے کے اپنے فیصلے کے متعلق بتادیا۔ ہم نے اتنی عمدہ تصویر کشی کی کہ لڑکیاں جو ہم سے چند سال چھوٹی تھیں، اُتنا ہی جذباتی ہو رہی تھیں جتنا کہ ہم تھے۔ اُنھوں نے ہمیں مشورہ دیا کہ ہم سب اکٹھے چلیں۔ ہم سب اکٹھے جائیں، محنت کریں، بچت کریں اور ہر اتوار کو فلم دیکھیں۔ ہمارے بچے ہوں گے، ہم اُنھیں تعلیم دلوائیں گے اور اُن کی ایسے پرورش کریں گے کہ اچھے انسان بن سکیں۔ قدرتی سی بات تھی کہ ہماری عمروں میں اضافہ ہو گا، ہم اکٹھے بوڑھے ہوں گے...... تاوقتیکہ موت ہمیں جدا کردے، سب ایک چھت کے نیچے......

غازی کی دوست نے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے پر مارا۔

''واہ......واہ...... یہ نہایت عمدہ ہوگا۔ نہایت عمدہ۔''

''ہمیں انتظار نہیں کرنا چاہیے۔'' میرے والی نے مشورہ دیا۔ ''ابھی چلتے ہیں۔''

ہم نے ایک نعل دیکھ لی تھی، اب ہمیں تین نعلوں اور ایک گھوڑے کی ضرورت ہوگی اور ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔

اگلے دِن ہم نے پارچہ بافوں، رشاط اور احمد کو ڈھونڈا۔ رشاط اور احمد بھائی تھے اور دونوں کے رنگ کاغذ کی طرح سفید تھے۔ ہم ایک دوسرے کو یورگی کے چھان بورے کی دکان کے دِنوں سے جانتے تھے اور وہ دونوں فٹ بال کے شوقین تھے۔ وہ کارخانے میں کئی سالوں سے کھڈیوں پر کام کر رہے تھے۔ وہ بہت تھکی تھکی آنکھوں اور کپاس سے بھرے ہوئے لباس سے فٹ بال کھیلنے کے لیے آتے۔ وہ ہمیں کارخانے میں دیکھ کر حیران ہوئے۔ احمد نے ہماری اِس درخواست کو کہ ہمیں سکھایا جائے کہ کھڈیاں کیسے چلائی جاتی ہیں، بہت غور سے سنا۔

''کیا مطلب؟'' اس نے کہا۔ ''تم لوگ، کپڑے بنو گے؟''

اس نے رشاط کی طرف دیکھا۔

''یقیناً، کیوں نہیں؟'' اُس نے کہا۔

''سو تم لوگ سیکھنا چاہتے ہو کہ کھڈی کو کیسے چلایا جائے؟''

''حیرانی کی کیا بات ہے۔ بُننا کوئی بڑی کاری گری نہیں۔ ہے نا؟''

دونوں بھائی رکی رکی سی ہنسی ہنسے۔

''جانتے ہو'' رشاط نے اپنے بڑے بھائی سے کہا۔ ''اِن کا خیال ہے کہ بُننا، فٹ بال کھیلنے کی طرح ہے......''

''ایسے ہی لگتا ہے۔'' احمد نے کہا۔ ''آپ کے ہاتھ دیکھتے ہیں۔''

ہم نے ہاتھ آگے بڑھا دیے۔

''چھوٹی سی معصوم چیزو...... اِن نرم ہاتھوں کو دیکھو...... اب میرے دیکھو۔'' اُس کے ہاتھ سخت تھے۔

''ہم اپنے والدین کے سہارے زندگی نہیں گزارنا چاہتے۔'' غازی نے تفصیلاً بتایا۔ ہمیں صرف اتنا بتاؤ، کیا ہمیں بُننا سکھاؤ گے یا نہیں؟''

''ہمیں تمہیں سکھانے میں کوئی اعتراض نہیں۔'' احمد نے کہا، ''لیکن......؟''

''لیکن کیا؟''

''تم ایک ہفتہ نہیں نکال سکو گے۔''

ہمارے ساتھ یہ وعدہ کر کے کہ وہ اپنے فورمین کے ساتھ بات کریں گے اُنہوں نے ہمیں کاروباری علاقے سے چلتا کیا۔

کچھ عرصہ کے بعد حسن حسین کو جب اس بات چیت کا علم ہوا تو وہ کافی غصے میں آیا۔

''تمہیں'' اُس نے مجھے ایک طرف کھینچ کر کہا۔ ''اُس کے ساتھ نہیں جانا چاہیے! تمہیں تو زیادہ معلوم ہونا چاہیے۔''

''مجھے کیا معلوم ہونا چاہیے؟ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''یہ مت بھولو کہ تمہارے والد کون ہیں؟''

غازی اس بے عزتی سے بے خبر تھوڑے فاصلے پر، ہونٹوں کے درمیان میں لٹکتے سگریٹ کے ساتھ، اپنی پھڑ کیلی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، فرضی گول کی طرف چھوٹے چھوٹے پتھروں کو ٹھڈے مار رہا تھا۔

(II)

اگلے دن میں طلوعِ صبح سے پہلے جاگا اور چپکے سے گھر سے نکل گیا۔ میں نے اپنے کوٹ کو کاندھے پر لٹکایا اور سگریٹ سلگا لیا۔ میں نے پارچہ باف کی طرح تیلی کو رگڑا اور تجربہ کار پارچہ باف کی طرح سگریٹ کو سلگایا اور اُس پارچہ باف کے تکبر کے ساتھ جو اپنی کھڈیوں کو اچھی طرح جانتا ہے، آسمان کی طرف دھوئیں کا ایک مرغولہ نکالا۔

غازی اپنے دروازے کے ساتھ میرا منتظر تھا۔ اُس نے بھی اپنا کوٹ کندھے پر لٹکایا ہوا تھا۔

''کیا حال ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''زبردست۔'' اُس نے کہا۔

ہم نے دھیان نہیں دیا تھا کہ اُس کا باپ کھڑکی سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔

''سنو۔'' اُس نے نیچے کی طرف منہ کر کے زور سے کہا۔ ''اپنے آپ کو دیکھو۔ دیکھو کہ تعلیم کے بغیر کیا ہوتا ہے۔''

جب ہم گلی کی نکڑ پر موڑ مڑ رہے تھے، غازی تعلیم یافتہ لوگوں پر لعنت بھیجتے ہوئے اُنھیں گالیاں دے رہا تھا۔

''مجھے ایک سگریٹ دو!''

تھوڑی دیر کے بعد ہم متجسس اور پُراُمید محسوس کرتے ہوئے بڑی سڑک پر آ گئے۔

...تیں، آدمی، بچے اور مزدور......سڑک لوگوں کے سمندر سے بھری ہوئی تھی اور ہم نے اُن کے درمیان میں غوطہ لگا دیا۔

ہم کارخانے تک پہنچ گئے اور جیسے ہی اندر داخل ہوئے تو کھڈیوں کی بے ہنگم کھٹ کھٹ سے میرا سر چکرانے لگا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ تمام کارخانہ میری طرف سرپٹ بھاگتے ہوئے آ رہا ہے۔ کارخانہ گرد کا ایک بادل تھا جو اپنی کھٹ کھٹ کی پیچیدہ ترتیب کی وجہ سے کانپ اور تھرتھرا رہا تھا۔ چاروں طرف کپاس کے ٹکڑے تھے اور مجھے نشاستہ کی بو محسوس ہوئی۔ میرے ردِعمل پر ہنستے ہوئے احمد مجھے بازو سے پکڑ کر آگے بڑھتا رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ دوسرے کارکن حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے اور ہمیں دیکھ کر اتنا ہی محظوظ ہو رہے تھے جتنا کہ احمد اور رشاط۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے بیروت کے چھاپہ خانے میں پہلی مرتبہ کام شروع کیا تھا تو ایسے ہی محسوس کیا تھا۔

احمد جو دو مشینوں کا ذمے دار تھا، میری طرف منہ کر کے کھڑا تھا۔ وہ اپنی بغیر آواز والی ہنسی کو نہ روک سکا اور مجھے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اُسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ ہو۔ وقفے وقفے سے اس کی توجہ تھوڑی دیر کے لیے ٹوٹے ہوئے دھاگے کی طرف ہو جاتی، اپنی توجہ میری طرف کرنے سے پہلے وہ دھاگے کو ایک ماہر کی طرح کھینچتا اور ماہرانہ طریقے سے ایک گانٹھ دیتا۔

''اِس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟'' میں نے آخرکار پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں۔'' اُس نے کہا۔

''میں نہیں مانتا، کیا بات ہے؟''

''میں تمھاری طرف دیکھ رہا تھا اور خدا کے پراسرار طریقوں پر غور کر رہا......''

''کیوں؟ کس لیے؟''

''تم کیا سوچتے ہو؟ کہ ایک عظیم باپ کا بیٹا میرے جیسے آدمی کے پاس آئے......''

مجھے اپنی زندگی میں ایسے عزت و احترام والے رویے سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔

''میں تمھیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے ویٹر کے طور پر بھی کام کیا ہے۔ مجھے اس کام کا مزہ بھی آتا تھا۔ دوسری باتوں کو بھول جاؤ۔ خدا کی آنکھوں میں ہم سب برابر ہیں۔ میں کوئی نازک سا، بگڑا ہوا بچہ نہیں ہوں۔''

میرے سب کچھ کہنے کے باوجود وہ اپنا سر ہلا رہا تھا اور ابھی تک خدا کے پراسرار طریقوں پر غور کر رہا تھا۔

''اِسے ہم شٹل کہتے ہیں۔'' اُس نے چھوٹی سی تارپیڈو کی شکل کی چیز کو ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ چھوٹی سی چمک دار چیز کے دونوں کنارے نوکیلے تھے اور اُسے تیز پیلا رنگ کیا گیا تھا۔

''اِس وقت شٹل خالی ہے۔ جب یہ خالی ہو تو اسے ایسے کھولتے ہیں، تکلے کو ایسے باہر نکالو اور اس کی جگہ بھرا ہوا رکھ دو۔ اِسے ایسے بند کرو اور یہاں سے ایسے پھینکو......''

''............؟''

''یہ تناؤ پیدا کرنے والا بازو ہے۔''

''............؟''

''کھڈی کا ڈھانچہ......''

''............''

نشاستہ کی بو، کپاس کی گرد کا بادل اور مسلسل کھٹ کھٹ مجھ پر حاوی ہو رہے تھے۔ میں استنبول اور دوسرے منصوبوں کے متعلق بھول چکا تھا۔ احمد نے میری کہانی کے دورے کے درمیان میں مجھے ٹوکا۔

''ہمارے کارخانے میں ایسے ہی ہے۔'' اُس نے کہا ''میرا بھائی اور میں یہ گرد تب سے نگل رہے ہیں جب سے ہم اتنے تھے۔ اب تک ہمارے پھیپھڑے اِس مواد سے بھر گئے ہوں گے۔''

پھر ہم بیت الخلا کی طرف گئے اور ہلکے پھلکے ہو گئے۔ مگر میرے کان گونج رہے تھے۔ گزرگاہ ایسی بے ڈھنگی تحریروں سے بھری ہوئی تھی: ''لارڈز کا گھر''، ''اس پر بیٹھو''۔ ''باقر یہاں آیا تھا'' اور ملتی جلتی دوسری تحریروں کے ساتھ۔ ہمارے سامنے بیت الخلاؤں کی قطار تھی۔

''بیت الخلاؤں کے دروازے آدھے کیوں کھلے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لیے کہ لوگ یہاں وقت نہ ضائع کریں۔'' احمد نے تفصیل بتائی۔ ''اور نگران آسانی سے پڑتال کر سکے۔''

"بیت الخلا میں کوئی زیادہ وقت کیوں ضائع کرے گا؟"

"جب تم یہاں کچھ وقت گزارو گے تو سمجھ جاؤ گے۔ لوگ بیت الخلا میں وقت ضائع کرنے کو کھڈی پر کھڑے ہو کر گرد نگلنے پر ترجیح دیتے ہیں۔ جب تم یہاں ہوتے ہو تو کئی باتیں سوچنا شروع کر دیتے ہو...... میرا یقین کرو، جب میں بیت الخلا میں ہوتا ہوں تو میرا ذہن بھٹک جاتا ہے، میں دنیا میں کہیں بھی ہو سکتا ہوں۔ میں آنکھیں بند کرتا ہوں اور کسی دھارے پر بہہ نکلتا ہوں......"

نگران سیٹی بجا رہا تھا اور کارکنوں کو کارخانے کی طرف آنے کے لیے مجبور کر رہا تھا۔

بیت الخلا کے نیچے سے بہتے ہوئے گندے پانی میں ہم نے اپنے سگریٹوں کے ٹوٹے پھینکے اور مشینوں کی طرف آ گئے۔

میرے لئے یہ بتانا مشکل ہے کہ میں نے دن کیسے گزارا۔ غازی بھی بری طرح تھکا ہوا اور گرد میں اٹا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"کیسے لگا؟" میں نے پوچھا۔

"مزہ نہیں آیا۔" اُس نے کہا۔

میں نے اپنے سامنے سے گزرتی ہوئی خواتین کارکنوں کی طرف اشارہ کیا۔

"درمیان والی کے متعلق کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا "کوشش کریں؟"

اُس نے ناگواری سے مجھے دیکھا۔

"کیا مسئلہ ہے؟ غصیلی نظر کیوں؟"

"میں یہاں تباہ حال ہوں اور تم ہو کہ......"

گلی والے دروازے میں دادی میرا انتظار کر رہی تھی۔

"یہ کیا دیکھ رہی ہوں" اُس نے مانگ کی، "تم کہاں تھے؟"

"سکول" میں نے جھوٹ بولا۔ "ہمارا والی بال کا میچ تھا۔"

"میرے ساتھ جھوٹ مت بولو۔ تم ایک عرصے سے سکول نہیں گئے ہو۔ میں یقینی طور پر جانتی ہوں۔ سو مجھے سچ سچ بتاؤ۔ تم کہاں تھے؟"

"میں نے کہا نا، میں سکول میں تھا۔"

"گرد اور یہ کپاس کے ٹکڑے کہاں سے آئے؟"

میں نے ہار تسلیم کر لی۔

"میں کارخانے پر کام کر رہا تھا۔"

"کیا کہا؟"

"ایک کارخانہ!"

"کیسا کارخانہ؟"

"یہ ایک عام سا کارخانہ ہے...... میں کھڈیوں پر کام کر رہا ہوں۔"

وہ آگے کی طرف جھکی

"سچ مچ؟"

"ایمان داری سے!"

"تم جسمانی مشقت کر رہے ہو؟"

"ہاں۔ میں جسمانی مشقت کر رہا ہوں!"

اُس نے بلند آواز میں بین کرنا شروع کر دیا......

اندر جا کر میں نے لباس تبدیل کیا اور خوب نہایا۔ وہ صوفے کے کنارے پر بیٹھی ہوئی تھی، اس کی پشت سیدھی اور اکڑی ہوئی تھی۔ میں تخت پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ آہستہ سے میرے پاس آئی۔

"تم مجھے صرف تنگ کر رہے تھے۔ ہے نا!"

میں نے جواب نہیں دیا۔

"میں جانتی تھی کہ تم مذاق کر رہے تھے۔" اُس نے بات جاری رکھی۔ "میں جانتی تھی کہ تم مجھے تنگ کر رہے تھے۔ میرے بچے کی تو اُمنگیں تھیں! وہ اتنا نیچے نہیں جا سکتا! یاد ہے، جب تم چھوٹے تھے تو تمھاری پھوپھیاں پوچھا کرتی تھیں کہ تم بڑے ہو کر کیا بنو گے اور تم اُنھیں بتایا کرتے تھے کہ تم ترکی کے مشہور ترین ڈاکٹر بنو گے! میرا بچہ تو جسمانی مشقت......"

اپنے اندر، مجھے شفاف، پرخلوص قہقہہ سنائی دیا اور رشاط کی خوبصورت اور طفلانہ نظریں دکھائی دیں۔ میں نے بوڑھی عورت کو تقریباً گالی ہی دے دی۔ وُہ غایب الذہن، زیرِ لب کوئی دعا بڑبڑاتے ہوئے، غیر موثر طریقے سے چلی گئی۔

(III)

اگلے دِن اور اُس سے اگلے دِن، مجھے گھر سے باہر نکلنے کے لیے دادی سے جھگڑا کرنا پڑا۔ غازی اور میں اپنے کوٹ کندھوں پر لٹکا کر سگریٹ سلگاتے اور کارخانے کی طرف چل پڑتے۔ ہم نے جلد ہی رسوں کے بارے میں سیکھ لیا۔ احمد باقاعدگی سے مشینیں میرے حوالے کر کے چلا جاتا۔ میں ڈھیلے سروں کو گانٹھنے، دھاگوں کو گزارنے، کپڑے کے تھان کو کاٹنے اور کھڈی کو لپیٹنے کا کام اُتنی مہارت سے کرسکتا تھا جتنا وہ۔ غازی کی اہلیت بھی ایسے ہی تھی۔ جب دن کا ہمارا کام اختتام پذیر ہوتا تو ہمارے پاس اتنا وقت ہوتا کہ ہم لڑکیوں کے متعلق باتیں کر سکتے۔

''تمھیں اتنی ہی تربیت کی ضرورت تھی۔'' ایک دن احمد نے کہا۔ ''میں ابھی جا کر سپروائزر کو بتاتا ہوں۔ وہ شاید تمھارا امتحان لینا چاہے گا، سو تیار رہنا۔''

اُس نے جا کر اُسے بتایا۔ سپروائزر وہاں آ گیا۔ وہ لمبا، دبلا، سیاہ جلد والا ایک فریبی قسم کا آدمی تھا۔ اُس کی آنکھیں نکروں کی وجہ سے سرخ تھیں۔ اُس نے مجھے مشین روکنے کو کہا۔ میں نے علیحدگی والے لیور کو کھینچ کر مشین کو روک دیا۔ اُس نے چار یا پانچ دھاگے توڑے اور مجھے جوڑنے کو کہا۔ میں نے فوراً جوڑ دیے۔ بنے ہوئے مال کے بولٹ کو الگ کرنے کے بعد اُس نے کھڈی کو لپیٹنے کو کہا۔ وہ مطمئن نظر آیا۔

''بہت خوب!'' اُس نے کہا۔ ''میں یہ یقین کرلوں گا کہ سب سے پہلے خالی ہونے

والی مشین تمھیں ملے۔''

بعد میں پتا چلا کہ غازی بھی کامیاب ہوگیا ہے۔ مشین کب میسر آئے گی؟ ہم کمانا کب شروع کریں گے؟ تا کہ ہم کما اور پھر جا سکیں!

کوئی بھی مشین مستقبل قریب میں خالی ہونے والی نہیں تھی۔ تمام تجربہ کار کارکنوں کے ساتھ زیرِ تربیت لوگ مفت میں کام کر رہے تھے۔ زیرِ تربیت لوگوں کی اکثریت نے تیزی کے ساتھ اپنا کام سیکھ لیا، قابل تعریف طریقے سے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور اُن سب کو بتایا گیا ہوگا کہ سب سے پہلے خالی ہونے والی مشین اُنھیں ملے گی۔

کافی عرصے کے بعد ہمیں پتا چلا کہ ہم فالتو پرزے ہیں۔ فیکٹری کے مینیجروں نے ہمیں صرف اِس لیے تربیت دلائی تھی کہ تجربہ کار کارکنوں پر دباؤ رہے۔

یہ واقعہ اُس مشین پر ہوا جو، جہاں پر ہم تھے، وہاں سے دو مشینیں دور تھی۔

ایک دن کر ددرسن جس مشین کو چلا رہا تھا، اُس مشین نے ایک شٹل کو باہر پھینکا اور البانیہ کا نوری بے ہوش ہوگیا۔ ہم سب اُس طرف بھاگے۔ اس کا منہ مچھلی کی طرح بند اور کھل رہا تھا۔ لگ رہا تھا کہ شٹل اُسے کان پر لگا ہے۔ کسی نے جا کر اُس منزل کے سپروائزر کو بتایا۔ سپروائزر زخمی آدمی کا معائنہ کر کے تیزی سے باہر چلا گیا۔ وہ جلد ہی چھوٹے قد والے موٹے چیف مشین کار، بھاری بھر کم منتظم، بھتے ناک والے مینیجنگ ڈائریکٹر اور مالک بذاتِ خود اپنی سوکھی ہوئی ٹانگوں اور جسم کی مناسبت سے بڑے پیروں پر اپنے بھاری پیٹ کو اٹھائے ہوئے، کے ساتھ تیز تیز چلتے واپس آیا۔ ہر ایک نے ایک دم بولنا اور اونچی آواز میں ہدایات دینا شروع کر دیا۔ اِسی اثنا میں ہمارے فورمین نے جا کر بجلی کا مین سوئچ بند کر دیا۔ کارخانہ فوراً بند ہوگیا۔

کر ددرسن جس کی مشین نے شٹل پھینکا تھا، کاغذ کی طرح سفید ہوگیا تھا۔ کارخانے کے مالک نے شور کرنا اور گالیاں دینی شروع کر دیں۔ ایک وقت پر ایسے لگنے لگا کہ وہ کسی کو تھپڑ مار دے گا۔ کر ددرسن نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پرے دھکیل دیا۔ اس سے وہاں ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ کسی نے کسی کا گریبان پکڑ لیا، لوگوں نے فقرے کسے اور سیٹیاں بجائیں، وہاں افراتفری کا عالم تھا۔ میں نے اوپر دیکھا تو مجھے ڈرسن کے بوٹ نظر آئے جو ہمارے سروں کی بلندی پر حرکت کر رہے

تھے۔ مجمع اُسے اوپر اٹھا کر بے قدری کے ساتھ کارخانے سے باہر پھینک رہا تھا۔

احمد نے جو میرے ساتھ کھڑا تھا اتنی اونچی آواز میں گالی دی کہ سب سن لیں۔ پھر وہ مجھے ایک طرف لے گیا۔

''چلو۔ سگریٹ پئیں۔''

ہم بیت الخلاؤں والے راستے پر ہو لیے۔

''تمھارے خیال میں کیا ہوگا؟''

احمد بے چینی کے ساتھ سگریٹ سے راکھ جھاڑ رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ اُس کے ذہن میں کوئی اور بات ہے۔

''کس کا کیا ہوگا؟'' اُس نے پوچھا۔ ''مشین میں سے شٹل اڑ کر باہر آیا جو آدمی کے کان پر لگا۔ اب وہ اس کا الزام ڈرسن پر لگا رہے ہیں کہ اگر وہ مر جائے تو اُنھیں معاوضہ نہ دینا پڑے۔ لیکن......''

اُس نے دانتوں کے درمیان میں سے فرش پر تھوکا۔

''آدھا قصور مشینوں کا ہے لیکن دوسرا آدھا ہمارے سپروائزر کا......''

''وہ کیسے؟''

''سپروائزر اُس کا رشتے دار ہے۔ ہمیں جو دھاگہ ملتا ہے۔ اُس کے اندر گانٹھیں ہوتی ہیں۔ جب شٹل کسی گانٹھ سے ٹکراتی ہے تو تھپ! وہ گیا۔ اُسے معلوم ہے کہ ایسے ہوتا ہے لیکن وہ اِس کا سدباب نہیں کرتا۔''

''البانوی نوری پھر مر بھی سکتا ہے؟''

''ممکن ہے......''

''واقعی وُہ مر سکتا ہے؟''

''مجھے ایک اور واقعہ یاد ہے جب مشین کا شٹل اِسی طرح اُڑ کر آیا تھا جو ہمارے اچھے ساتھی ''لیز'' حیدر کو لگا۔ خدا اُسے جنت دے، وہ ایک اچھا آدمی اور اپنی بات کا پکا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ اگر آپ کہیں کہ دوست چلو ایسے کرتے ہیں، وہ فوراً شامل ہو جاتا، چاہے دوزخ آ

جائے یا پانی کی لہریں۔ بحر حال یہ شٹل اڑا اور اُس کے کان میں ایسے لگا کہ اندرونی طور پر خون بہنے لگا۔ غریب موقع پر ہی مر گیا۔ جانتے ہو کہ میرے ماں باپ فوت ہو چکے ہیں لیکن میں اُن کے مرنے پر اتنا نہیں رویا تھا جتنا بے چارے حیدر کے مرنے پر۔ جانتے ہو کیوں؟ وہ ایک مخلص دوست تھا۔ وُہ ہمیشہ آپ کے ساتھ کھڑا ہوتا!''

''وہ مر گیا......آہ؟''

''موقع پر ہی مر گیا۔ یہاں موت ایسے ہی ہے۔ تمھیں پتا چلنے سے پہلے ہی آ لیتی ہے......''

''کیا البانیہ کا نوری شادی شدہ ہے؟''

''چار بچوں کا باپ تھا۔ اُس کی بیوی ایک ہمت والی عورت ہے۔ اس کارخانے کے دھاگے والے سیکشن میں کام کرتی تھی۔ وہ کریٹ کی رہنے والی ہے۔ لیکن صحیح معنوں میں عثمانی ہے۔''

''اگر آج والا مر گیا تو وہ بچوں کو ہرجانہ دیں گے؟''

''اُس کا انحصار ہمارے بیانات پر ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ کیا ہوا؟ وہ سب کے سب دُرسن کے خلاف ہو گئے۔ پتا ہے کیوں؟ یہ ایسے ہے کہ وہ کوشش کریں گے کہ اِسے اُس کی لاپروائی ثابت کر سکیں۔ اگر اُس کی لاپروائی ثابت ہو گئی تو وہ کہیں گے کہ حادثہ اِس وجہ سے ہوا تھا۔''

''دُرسن اس میں دھر لیا جائے گا۔''

''ایسے ہی ہو گا......''

ہم مشینوں والے حصے میں واپس چلے گئے۔ مالک، ہمارا سپروائزر، ایڈمنسٹریٹر اور مشین کار، سب وہاں موجود تھے۔ اُنھوں نے کام کرنے والے اکٹھے کیے ہوئے تھے۔ وُہ سب کے سب کسی بحث میں الجھے ہوئے نظر آئے۔ ہم بھی اُن میں شامل ہو گئے۔ وہاں اتنی آوازیں بلند ہو رہی تھیں کہ کسی قسم کا اختلاف رائے محسوس ہوا۔ پھر ایک کپڑا بننے والا، جسے میں نے اُس کے سیاہ چشمے سے پہچانا، بھیڑ میں سے درمیان میں آیا۔ میں نے اُس کے لہجے سے اندازہ لگایا کہ وہ غصے میں نہیں۔ لیکن اُس کے پیچھے کھڑے لوگ دھکے دینے لگے۔

''ہم نہیں......!'' کوئی چیخا۔ مجمع میں ''ہم نہیں! نہیں، ہم نہیں'' کا شور گونجنے لگا۔ وہاں اچانک افراتفری کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ لوگ ایک دوسرے کے اوپر چھلانگیں لگا رہے تھے۔ احمد آگے کی طرف بھاگا۔ ہوا میں شٹل اُڑ رہے تھے اور میں نے گالیوں کی آواز سنی۔ لوگ مشینوں کے بیچوں بیچ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

ایک بڑا شٹل میرے سر کے پاس سے سیٹی بجاتے گزرا اور دوسرا روشنی والے بلب میں جا کر لگا۔ میں نے سیاہ چشمے ہوا میں اڑتے دیکھے......

یہ سب کچھ دیر جاری رہا۔ پھر، کارخانے کے دروازے پر پولیس آ گئی۔ وہ سات، آٹھ یا شاید دس لوگ تھے۔ وہ سیٹیاں بجاتے ہوئے اندر آئے۔ بُنا ہوا کافی سارا کپڑا پھٹ گیا۔ آخر کار وہاں خاموشی ہو گئی۔ پولیس متعدد کپڑا بننے والوں کو پکڑ کر لے گئی، جن کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا اور کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ احمد کی آنکھ پر زخم آ گیا تھا اور وہ سوج گئی تھی۔ وہ کانپ رہا تھا۔ اچانک وہ تیزی کے ساتھ دوبارہ آگے کی طرف بڑھا۔ وہ پولیس کے افسر کے پاس گیا اور غصیلے لہجے میں کچھ باتیں کر کے واپس آ گیا۔

''تم مشینوں پر نظر رکھو۔'' اُس نے مجھے کہا۔ ''میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔''

''تم کہاں جا رہے ہو؟''

''وہ کچھ لڑکوں کو لے کر جا رہے ہیں۔ میں اُنھیں بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا۔ میں اپنا بیان لکھوانے کے فوراً بعد آ جاؤں گا۔''

اُس نے لوہے کے ڈنڈے پر لٹکے ہوئے اپنے کوٹ کو اُتارا اور باہر چلا گیا۔

جب دن ختم ہوا تو غازی سے مل سکا۔

''کیا خیال ہے؟'' اُس نے کہا۔ ''تمھارے خیال میں اب ہمیں کام مل سکے گا؟''

''مجھے کوئی اندازہ نہیں......''

''اُڑتے ہوئے شٹل کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟''

''احمد کہتا ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی مر سکتا ہے۔ وُہ کہتا ہے کہ اپنے مر جانے کے متعلق جاننے سے پہلے ہی ہم میں سے کوئی بھی مر سکتا تھا۔''

''میرے خیال میں شدید افراتفری کا عالم تھا۔ فیکٹری کے مزدور بے پناہ دباؤ میں ہیں۔ میرے اور تمھارے درمیان میں، میں حقیقتاً پریشان تھا...... اگر کسی دِن ہمارے شٹل لگ جائے تو کیا ہوگا؟''

''کیا مطلب؟ تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟''

''میں کہہ رہا ہوں کہ شٹل کے سر میں لگنے کا خطرہ ہے...... تمھارے پاس سگریٹ ہوگا؟''

''ہاں، سگریٹ ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ تمہارے سر میں شٹل لگ سکتا ہے؟ اگر لگ جائے تو کیا ہوگا؟''

''اس کے متعلق سوچو! مجھے ماچس دو۔ تمھارے خیال میں کیا ہوگا؟''

''اگر عظیم غازی مر گیا تو یہ دنیا کا اختتام نہیں ہوگا؟ کیا ایسے ہوگا......؟''

''کون کہتا ہے کہ ایسے ہوگا؟ میرے بغیر تم لوگ کس کام کے ہو؟''

واپس جاتے ہوئے ہماری ٹیم کپتان سے ملاقات ہوئی؟ وہ اپنے ٹیڑھے بائیسکل پر جا رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ رک گیا۔ اُس نے سختی سے پوچھا کہ کچھ عرصے سے ہم تربیت پر کیوں نہیں آ رہے؟ چناں چہ ہم نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ اُس نے کہا کہ ہمیں اپنے آپ سے شرم آنی چاہیے۔ کوئی عزت دار سارا دِن کھڈی پر کیسے گزار سکتا ہے؟

''غور سے سنو لڑکو، لیگ کے مقابلے بالکل قریب ہیں۔ تم سب کو تربیت پر باقاعدگی سے آنا چاہیے۔ ٹھیک؟''

غازی اور میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''تم ایک دوسرے کی طرف کیوں دیکھ رہے ہو؟'' کپتان نے پوچھا۔ ''کلب میں تم لوگوں کے ساتھ ملاقات ہوگی۔ اب یہ طے ہے۔ میں تمھیں تربیت کے وقت دیکھنا چاہتا ہوں......''

وہ اپنے ٹیڑھے بائیسکل پر چلا گیا، گالف کی پتلون میں ایک بڑی تشریف اور دور فاصلے میں غائب ہوتا گیا۔

''کہتا ہے کہ وہ ہمیں کلب میں ٹھیک ٹھاک دیکھنا چاہتا ہے۔'' غازی نے کہا۔ ''سنا تم نے!''

''سو؟ ہفتے میں پانچ سکے یا دس سکے۔ پھر کیا ہوگا؟''

''میں جانتا ہوں کہ یہ زیادہ نہیں لیکن تمھیں شٹل کے متعلق بھی سوچنا چاہیے......''

''مطلب......؟''

''مطلب، یہ اتنا اہم نہیں......'' اُس نے کہنا شروع کیا اور پھر ہنسنے لگا۔

''یہ تو ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا ''لیکن ہم احمد اور رشاط کے ساتھ دھوکہ کر رہے ہوں گے، اگر ہم نے چھوڑ دیا تو......!''

اگلے دن ہم نے احمد کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔

''میں جانتا تھا!'' اُس نے کہا ''میں جانتا تھا کہ تم کمزور ہو۔ تمھیں آسانی سے کمایا جانے والا پیسہ چاہیے، نہیں؟ ڈیسک والی کہیں نوکری، ایک اچھا سا قلم اور تھوڑا سا کاغذ......''

ہم نے ملازمت فوراً نہیں چھوڑی۔ اُنھوں نے مزدوروں کے پورے گروہ کو فارغ کر دیا اور اُن کی جگہ ہمیں، اُن کے ''فالتو پرزوں'' کو رکھ لیا۔ اُس تمام کارروائی کے اختتام پر ہمیں اپنی اپنی مشینیں اور کام مل گیا۔ لیکن کس قیمت پر؟

ہم نے ملازمت چھوڑ دی۔

(IV)

لیگ کے میچ شروع ہو گئے اور اتھلیٹک مقابلے بھی۔ ہماری خوراک اور جو کیلوریاں ہم ضائع کرتے تھے، اُن کے درمیان میں بہت فرق تھا۔ غازی اور میرے وزن میں کافی کمی ہوئی۔ ہمیں اپنی سوکھی ہوئی ٹانگوں اور پھٹے کی طرح ہموار چھاتی دیکھ کر بہت شرم آتی۔

اُس رات میں روٹی کا چوتھائی حصہ جس پر نمک، سرخ مرچ اور دھنیا چھڑکے ہوئے تھے، کھا کر سویا۔ چوں کہ مہینے کا آخیر قریب تھا، دادی میرے لیے اِسی کا بندوبست کر سکی۔

اگلی سہ پہر ہمارے اتھلیٹک مقابلے تھے۔ میں نے دو سو میٹر، پندرہ سو میٹر اور چار ضرب ایک سو میٹر ریلے بھاگنا تھیں۔

''یاد رکھو لڑکو!'' ٹیم کے کپتان نے کہا۔ ''تم لوگوں نے دوپہر کے کھانے پر گوشت نہیں کھانا اور پیاز بالکل نہیں۔''

غالباً وہ کہنا چاہ رہا تھا کہ اگر ہم نے یہ سب کھا لیا تو تیز نہیں بھاگ سکیں گے۔

ہم کلب گھر میں ٹیبل ٹینس کھیلتے اور گپ لگاتے رہے۔ غازی، حسن حسین کو مذاق کرتا رہا اور ہم شام کی دوڑوں پر باتیں کرتے رہے۔ اگر چہ ہم دوڑوں کی بات کر رہے تھے، میں نے دیکھا کہ حسن حسین لگاتار سگریٹ پی رہا تھا۔

اب ہم وہاں چالیس کے قریب لوگ تھے اور ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سے جانتے تھے۔ میں جا کر اُس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کے سگریٹ کا سرا چمک دار پی

کے ساتھ سجا ہوا تھا۔ ہم اور عمدہ سگریٹ؟

''کہاں سے لیے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ مت پوچھو۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تمھارا حصہ رکھا ہوا ہے۔ لیکن غازی کو نہیں بتانا!''

''ٹھیک ہے۔ لیکن یہ آئے کہاں سے؟''

''میں نے کہا نا، خدا کے واسطے مت پوچھو۔''

میرے لیے یہ جاننا ضروری تھا۔ میں اُسے دِق کرتا رہا۔ میں کیسے نہ جانتا؟ شاید اُسے کوئی دبا ہوا خزانہ مل گیا تھا۔ میں نے اُسے ایک خالی جگہ پر قابو کر لیا۔ وُہ اپنے آپ میں ہنسے جا رہا تھا۔ اُس نے اپنی ڈھیلی سی پتلون کی پچھلی جیب سے نیلی ڈبیہ نکالی۔

''ایک نظر ان سگریٹوں پر ڈالو۔ تمھارا حصہ الگ کیا ہوا ہے۔ مہربانی کر کے غازی کو نہ بتانا، وہ تمام ضائع کر دے گا......''

''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمھیں ملے کہاں سے؟''

''بیڑا غرق! تم پیچھا نہیں چھوڑو گے؟ دیکھو، معاہدہ ایسے سمجھو کہ تمھیں اپنا حصہ مل گیا ہے......اب تم سوال نہیں پوچھو گے۔ ٹھیک؟''

''چھوڑو......تم جانتے ہو کہ میں راز کی حفاظت کر سکتا ہوں۔''

''مجھے بے یقینی سی ہے۔ قسم کھاؤ کہ کسی کو بتاؤ گے نہیں۔''

مین نے قسم کھالی۔

''کپتان،'' اُس نے وضاحت کی 'اِنھیں میز پر بھول گیا تھا۔''

''اور تم نے......''

''میں نے......تم سمجھتے ہو......دیکھو......میں نے اُس سے ایک سگریٹ مانگا تھا اور اُس نے انکار کر دیا۔ کہنے لگا کہ میری سانس پھول جائے گی اور میں سہ پہر کو صحیح طرح بھاگ نہیں سکوں گا۔''

''اگر اُس نے دیکھ لیا تو؟''

'اس کی اُمید نہیں۔ وُہ کیسے دیکھ سکتا ہے؟ ایسے بھی نہیں کہ اُس کے پاس سگریٹوں کی لمی ہو۔''

جب وُہ یہ بات کر رہا تھا، کپتان بھاگتا ہوا آیا۔ حسن حسین کا رنگ فق ہو گیا لیکن پریشانی کی بات نہیں تھی۔ وہ ہمارے لیے کوکون والے بوٹ لایا تھا جو اُس نے ہمیں تھمانا شروع کر دیے۔ پھر اُس نے جیب میں سے پانچ کا نوٹ نکالا۔

''ایک مہربانی کرو۔'' اُس نے حسن حسین کو مخاطب کیا۔ ''مجھے بوسفورس سگریٹوں کی ڈبیہ لا دو۔''

حسن حسین کا اڑا ہوا رنگ واپس آ گیا۔ اُس نے رقم تھامی اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

ہمارا کپتان کھیلوں کا ایک مکمل جنونی تھا۔ وہ تیز رفتار مشین کی طرح سارا دن کلب ہاؤس کے چکر لگاتا رہتا، کمروں میں جاتا اور ٹیم کے ہر رکن کی ضرورت کا خیال رکھتا۔ ایک منٹ وہ آپ کے پاس ہے اور اگلے میں کسی اور کے ساتھ۔ ابھی وہ ایسے ہی کر رہا تھا، پتا نہیں کتنی مرتبہ اُس نے ہمیں ریس شروع کرنے کے لیے اور غلط سٹارٹ کے عوامل کے متعلق بتایا۔ جب حسن حسین نے اُسے سگریٹ پکڑائے تو وہ چار ضرب ایک کی ریلے ریس میں ڈنڈوں کے تبادلے کے متعلق بتا رہا تھا۔

میں نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ میرے لیے کھانے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ روٹی کا ایک ٹکڑا، باسی، خشک، روکھی روٹی کا ایک ٹکڑا۔

دو سو میٹر کی دوڑ میں، میں ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت کے فرق سے دوسرے نمبر پر رہا۔

ہم نے چار ضرب ایک جیت لی۔ میرا دل شدت کے ساتھ دھڑک رہا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل رہا تھا۔ میرا پیٹ گڑبڑ کر رہا تھا اور طبیعت خراب ہو رہی تھی۔ پھر پندرہ سو کے لیے میرا بلاوا آ گیا۔ میں جانتا تھا کہ زمین ہل نہیں رہی اور درخت اپنی جگہیں نہیں بدل رہے۔

''اب پتا چلے گا!'' کپتان نے کہا۔ ''اب پتا چلے گا۔ یہ دوڑ جیتنا ہمارے لیے لازمی ہے۔ اگر ہم جیت جائیں، تو اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم نہ جیتیں، پوائنٹوں کے حساب سے ہم آگے نکل

جائیں گے۔ پوری طاقت لگاؤ اور کر دکھاؤ......''

میں ٹھنڈے پسینے میں نہا گیا۔

''تم نے دوپہر کے کھانے پر گوشت تو نہیں کھایا؟''

''معذرت کے ساتھ؟ تم نے گوشت کھایا تھا؟ کس نے؟ میں نے؟''

''ہاں، تم نے......''

''میں نے نہیں کھایا۔''

''اچھی بات ہے۔ اپنی بھوک بچا کے رکھو اور آج رات جو دل کرے کھا لینا۔''

''؟؟؟''

میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور بھنویں کھچی ہوئی تھیں۔ میرے خیال میں ہم کل سات تھے اور دوڑ شروع کرنے کے لیے ایک قطار میں تھے۔ دوڑ شروع کرانے والے پستول کی ہم نے آواز سنی اور دوڑ پڑے۔ پہلا چکر ختم ہوا اور ہم دوسرے پر آ گئے۔ میری نظر کے سامنے اندھیرا گہرا ہو گیا اور پیٹ کی حالت خراب تر ہو گئی۔ ایسے محسوس ہوا کہ جیسے بوٹوں کے نیچے سے زمین سرک رہی ہے۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟

تیسرا چکر۔ میں پورا زور لگاتے ہوئے کپتان کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ باقی سب مجھ سے تقریباً دو قدم پیچھے تھے۔ کپتان کے ہونٹوں سے سگریٹ لٹک رہا تھا اور اُس کا زرد چہرہ اور بھی زرد ہو گیا تھا۔

''زور لگاؤ'' وہ چیخا ''آگے نکلو۔''

آخری زور، میں تھوڑا سا اور آگے نکل گیا۔

اب ہم چوتھے چکر پر تھے۔ چکر کے درمیان میں، میں اُس وقت تک سب سے آگے تھا۔ میں چوتھے چکر کے آخیر پر پہنچ رہا تھا جب اچانک مجھے محسوس ہوا کہ درخت کا تنا میرے سر کے اوپر گر گیا ہے اور دنیا اوپر سے نیچے ہو گئی ہے۔

جب میں نے آنکھ کھولی تو نیلے آسمان میں روشن چاند چمک رہا تھا اور غازی میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''حرکت مت کرو۔'' اُس نے کہا۔

''ٹھیک ہے لیکن کیوں؟''

''بکواس بند کرو اور حرکت مت کرو۔''

''میں بے ہوش ہو گیا تھا؟''

''ہاں، تم بے ہوش ہو گئے تھے اور تمہاری وجہ سے سب کا بیڑہ غرق ہو گیا۔''

میں آہستہ آہستہ بیٹھ گیا۔ رات کا وقت تھا اور رات کی ٹھنڈک چاند کی چاندی جیسی روشنی کو خنک ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔ میرا جسم اکڑا ہوا تھا۔ پھر مجھے سب کچھ یاد آ گیا اور بھوک بدلہ لینے کی کیفیت میں لوٹتی محسوس ہوئی۔

''تم کپتان کے سامنے نہ آنا۔''

''کیوں؟''

''تم پندرہ سو ہار گئے اور پوائنٹس پر دوسرے نمبر پر رہے۔ یہ تمہاری مہربانی تھی۔'' حسن حسین نے مداخلت کی۔

''احمق انسان!'' اُس نے کہا ''تمھیں بے ہوش ہونے کی کیا ضرورت تھی؟''

وہ بظاہر مذاق کر رہا تھا۔ اُنھوں نے مجھے دونوں طرف سے پکڑ کر سنبھالا، گولہ بنائے ہوئے کپڑے میرے سپرد کیے اور ٹیکسی میں بٹھایا۔ حسن حسین نے ٹیکسی ڈرائیور کو ایک ڈاکٹر کا پتا دیا۔

''وہاں کیوں جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تم بیمار ہو۔''

''کون؟ میں؟''

''ہاں۔ تم......''

''میں بیمار نہیں ہوں۔ ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔''

''پھر تم بے ہوش کیوں ہوئے؟''

میں نے آگے جھک کر اُس کے کان میں سرگوشی کی۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

''ڈرائیور، ہمیں سلو کباب لے چلو۔''

ہم پر ہجوم ریستوران کی للچا دینے والی گوشت کی خوشبو میں داخل ہوئے۔ حسن حسین امیر آدمی کے طریقے سے ایک ویٹر کی طرف مڑا۔

''معاف کیجئے! مہربانی کر کے اِن بھلے لوگوں کا خیال کریں۔''

یہ کیا؟ یہ وہی حسن حسین ہے جسے ہم جانتے تھے۔

''حسن، ساتھی۔'' غازی نے کہا۔ ''جو کر رہے ہو اِس کے متعلق تمھیں پورا بھروسہ ہے۔ میں مکمل طور پر کنگلا ہوں اور یہ.....''

حسن حسین، بہت سنجیدہ تھا۔

''معاف کیجئے، ویٹر۔ اِن بھلے لوگوں کی طرف متوجہ ہوں۔''

ہم نے کبابوں کا آرڈر کیا۔ خوشی کے مارے ہم اکڑے ہوئے تھے۔ اِس کے ساتھ یہ فکر بھی تھی کہ ادائی کیسے کریں گے؟

حسن حسین نے نیلی ڈبیہ میں سے ہمیں سگریٹ پیش کیے اور جیسے ہی کباب آئے ہم نے سگریٹ کانوں کے پیچھے اڑس لیے اور تینوں کھانے پر دیوانہ وار ٹوٹ پڑے۔

کھانا ختم کر کے جب ہم ہاتھ دھو رہے تھے تو حسن حسین نے میرے کان میں سرگوشی کر کے بتایا کہ پیسے کہاں سے آئے تھے۔

''جانتے ہو نا کہ میں کپتان کے سگریٹ لایا تھا۔ ریزگاری میرے پاس تھی اور وہاں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔''

(V)

دادی نے سب سے چھوٹی پھوپھی کو التجا بھرا خط لکھا کہ کس طرح میں نے کپڑا بننے کی ملازمت کی اور میرا طرزِ زندگی پریشانی کا سبب تھا اور یہ بھی چاہا کہ وُہ مجھے اپنے گھر لے جائے۔ سب سے چھوٹی پھوپھی استنبول کے مضافات میں رہائش پذیر تھی اور اُس کی شادی ایک تاجر کے ساتھ ہوئی تھی۔ اُس نے فوراً قدم اٹھایا۔

ہمیں پندرہ صفحات پر مشتمل خط ملا۔ خط میں مجھے خطاب کیا گیا تھا:

''تم من مانی نہیں کر سکتے۔ لوگ کیا کہیں گے؟ جیسے ہی میرے بھیجے ہوئے پیسے تمھیں ملیں، تم نے فوراً آ جانا ہے۔''

میں نے سب سے پہلے غازی کو بتایا۔ اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''ناقابلِ یقین! کمال ہو گیا!''

''ہاں'' میں نے کہا ''لیکن تم تو یہیں رہ جاؤ گے۔''

''اور ہم سب کو بھول جانا! اگر تم چاہو تو میں تمھارے ساتھ جاؤں گا۔ میں اپنی ماں کے طعنوں سے تنگ آ چکا ہوں۔ وہاں جا کر ہم ملازمتیں حاصل کر لیں گے یا لازمی عسکری تربیت کے لیے چلے جائیں گے۔''

''اور جب لازمی عسکری تربیت کا سرٹیفکیٹ مل گیا، ہم اپنی دوستوں کے ساتھ شادی کر لیں گے۔''

''دوستوں کو بھول جاؤ۔ تمھاری پھوپھی کا پیسہ ہم دونوں کو وہاں پہنچانے کے لیے کافی ہوگا۔ ہم کشتی کے ذریعے جائیں گے اور کھلے عرشے پر سفر کریں گے۔''

ہم فیصلہ کر چکے تو ہم نے حسن حسین کے متعلق سوچا۔ ہم نے یہ اُس سے چھپائے رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔ لڑکیوں کو بتانے میں کوئی حرج نہیں ہوگا کیوں کہ اُنھیں ہم سے محبت تھی اور وُہ ہمارے لیے زندہ تھیں۔ اُس رات ہم سال خوردہ مصری توت کے پاس گئے اور ماچس کی تیلیو کے ساتھ لڑکیوں کو آنے کا اشارہ کیا۔ وہ آئیں تو ہم نے اُنھیں ساری بات سنائی۔ میرے وا نے رونا شروع کردیا۔

''تم جھوٹ بول رہے ہو!'' اُس نے کہا۔ ''تم نے وہاں پہنچتے ہی ہمیں بھول جا ہے۔''

یہ کیسے ممکن تھا؟ ہم تو اُن کے لیے زندہ تھے۔ اگر وہ نہ ہوتیں تو ہماری زندگی کس کام کی تھی؟

تین دنوں کے بعد بیروت سے اپنے ساتھ لائے ہوئے اٹیچی کیس، گھسے ہوئے بستر بند اور ٹوکری اٹھائے دادی کے گھر سے چلا آیا۔

میں جب ریل گاڑی کے سٹیشن پر پہنچا تو لڑکیاں وہاں موجود تھیں اور ہماری تمام تر رازداری کے باوجود حسن حسین بھی پہنچا ہوا تھا۔ میرے والی لڑکی اپنا سر بہن کے کندھے پر رکھے رو رہی تھی۔ حسن حسین اپنے چشمے اتار کر اُنھیں رومال سے صاف کر رہا تھا۔ پھر تیسری گھنٹی بجی، ریل گاڑی نے سیٹی بجائی اور حرکت کرنا شروع کردی۔ رومال لہرا رہے تھے اور میرے والی لڑکی کا سر ابھی تک اپنی بہن کے کاندھے پر تھا۔

غازی نے اگلے سٹیشن پر ریل گاڑی میں سوار ہونا تھا۔ جب ریل گاڑی وہاں پہنچی تو وُہ خالی ہاتھ، خالی جیب اور آدھی ڈبیہ سگریٹ لیے چھلانگ لگا کر سوار ہوگیا...... یہ اُس کا پہلا باقاعدہ سفر تھا۔ وہ سگریٹ کے ساتھ سگریٹ سلگا رہا تھا، تھوکے جا رہا تھا اور گو اُس کی عادت نہیں تھی، اپنے ناخن چبا رہا تھا۔

''میرا بایاں کان بھنبھنا رہا ہے؟'' اُس نے ایک وقت شکایت کی۔

''میرے باپ کو اگر میرے بھاگنے کا پتا چل گیا تو وہ کیا کرے گا؟'' تھوڑی دیر کے بعد اُس نے پوچھا۔

''اگر اُسے پتا چل گیا تو کیا ہوجائے گا؟'' میں نے سوال کیا۔

''کیا وہ تمھیں واپس بلوا لے گا؟''

''وہ ایسا نہیں کرسکتا۔'' میں نے کہا۔ ''تمہاری عمر اٹھارہ برس سے زیادہ ہے اس لیے تمہارا باپ تمھیں کسی صورت بھی واپس نہیں بھجوا سکتا۔ فکر مت کرو۔ قانون تمہاری طرف ہے۔''

وہ رُکا۔

''میرا بے چارہ باپ۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''وہ بتا رہا تھا کہ کیسے کبھی اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا، کیسے ایک دم اُسے چکر آنے لگتے۔ اور اُس کے گردوں میں پتھر ہیں......''

اُس نے لمبا سانس لیا اور سگریٹ سے راکھ جھاڑی۔

جب ہم میرسِن پہنچے تو سستے ترین ٹکٹ خرید کر بندرگاہ پر پہنچے۔ جھلملاتے سمندر میں جس جہاز نے ہمیں لے کر دور جانا تھا، شام کے آسمان میں کالا دھواں چھوڑنے میں مصروف تھا۔ چھوٹی کشتی پر ہمیں اُس تک لے جایا گیا۔ جہاز پر چڑھنے کے بعد میں نے اُس کے پیٹ کے کونے میں اپنا سامان رکھا اور ہم عرشے پر چلے گئے۔ ہم نے پیچھے مڑ کر میرسِن شہر کی روشنیوں کو دیکھا۔

''میرا بے چارہ باپ۔'' غازی نے دہرایا۔ ''آہ اُس نے گردوں کے پتھر......''

اُس نے لوہے کے جنگلے پر اپنا سر ٹکا دیا۔

شام کی اُداسی، غازی، شہر اور سمندر کی جھلملاتی روشنیاں...... میرا دل رونے کو آیا۔ آہستہ آہستہ اندھیرے میں ڈوبتے سمندر نے مجھے موت کے متعلق سوچنے پر مجبور کردیا۔ میں اندر سے افسردہ ہوگیا اور مجھے اپنی چھوٹی بہن کی، جو چار سال کی عمر میں فوت ہوگئی تھی، یاد ستانے لگی۔ مجھے اُس کا چھوٹا سا کفن، تنگ سی قبر اور خوبصورت کتبہ یاد آ گئے۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہم اِن پانیوں میں ہمیشہ کے لیے گم ہوجائیں گے۔

''ہمارے پاس کتنے پیسے بچ گئے ہیں؟'' غازی نے اچانک سوال کیا۔

''ہمارے پاس پچھہتر کوروس ہیں۔''

''میرے سگریٹ بھی ختم ہیں۔''

چناں چہ میں اُس کے لیے ساڑھے سات کوروس کے سستے سگریٹوں کی ڈبیہ خرید لایا۔

پھر ہم جہاز کے پیٹ میں اپنے سامان کے پاس آ گئے۔ بستر بچھا کر ہم ایک دوسرے کے پاس بیٹھ گئے۔ پیٹ کے ایک طرف ایک عمر رسیدہ آدمی اپنی ٹوپی کو پیچھے کی طرف سے آگے کو گھما کر شام کی نماز ادا کرنے میں مصروف ہو گیا۔ دوسری طرف سرخ کمر بند میں ایک نوجوان راکی (شراب) پی رہا تھا۔ وہاں برقعہ پوش خواتین، اردگرد بھاگتے شریر بچے اور جوان لڑکیاں تھیں جو شرم کے مارے گھٹنوں فرش پر جھکی بیٹھی رہتیں۔ اس بھیڑ میں ہم نے صرف ایک خاندان کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ میں خاندان کہتا ہوں، ہم اس جوڑے کو ادانہ سے جانتے تھے...... لیکن عورت خاصی عمر رسیدہ، جھریوں والی تھی اور اس نے گاڑھا میک اپ کیا ہوا تھا۔ ہم یہ بھی جانتے تھے کہ ایک بازو والا آدمی جسے وہ اپنا خاوند کہتی تھی، دراصل اُس کا دلال تھا۔ کون پروا کرتا ہے؟ ہم نے از سرِ نو اپنا تعارف کروایا اور جلد ہی ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلف ہو گئے۔

عورت کی بیٹی خوب صورت اور طرح دار تھی۔ عورت کے بھاری قہقہہ میں اُس کے نکوٹین والے دانت نظر آتے تھے اور اُس کی بیٹی شرمندہ سی ہو جاتی تھی۔

''ماں!'' وہ کئی مرتبہ کہتی۔

عورت کوئی توجہ نہ دیتی۔ وہ قہقہہ لگاتی، گپیں ہانکتی، آنکھیں مٹکاتی، ہمیں چھوتی، ایک کے بعد دوسرا سگریٹ سلگاتی اور متواتر بولے جاتی۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر ہم نے اُس کی زندگی کی کہانی سن لی۔ یہ ایسی کہانی تھی جس کی اِس قسم کی عورت سے توقع رکھی جاتی ہے۔ وہ لازمی طور پر ایک باعزت خاندان سے تعلق رکھتی ہیں لیکن اُن کے خاوند انھیں دھوکہ دیتے ہیں جس سے اُن کا نسوانی تکبر مجروح ہوتا ہے اور پھر وہ اپنی عزت کے لیے......

لیکن وہ حیران کن حد تک کھلے ذہن کی عورت تھی۔ وہ سگریٹ سلگاتی تو ہمیں ذہن میں رکھتی اور اگر ہم انکار کرتے تو ''لے لو، لے لو'' پر اصرار کرتی۔ گو میں اتنے سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن غازی میری سوچ میں دیتا۔ چناں چہ میں سگریٹ قبول کر لیتا، ایک یا دو کش لے کر بجھا کے جیب میں ڈال دیتا۔

جب میں عورت...... زمرد...... کو غور سے دیکھ رہا تھا تو یقیناً سو گیا ہوں گا۔ آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ ضیافت کی طرح کا ناشتہ لگا دیا گیا تھا اور غازی جس نے اپنا منہ بھی نہیں دھویا تھا، آلتی پالتی مارے ناشتے کے پاس بیٹھا تھا۔

''جلدی کرو'' اُس نے مجھے جاگتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ ''ہم ناشتہ کرنے والے ہیں۔ ہم صرف تمھارے منتظر تھے۔''

میں نے اُسے گھورا۔ میں یہ کہتے ہوئے کہ منہ ہاتھ دھولوں، وہاں سے نکل گیا۔ میں واپس جانے کے بجائے عرشے پر چلا گیا جہاں صبح کی ہوا ٹھنڈی اور سمندر پرسکون تھا۔ ہمارا جہاز ساحل کے نزدیک رہتے ہوئے بڑھے چلا جا رہا تھا۔

غصے سے سرخ غازی میرے پاس آیا۔

''تم ناشتہ کرنے کیوں نہیں آتے؟''

میں نے اُس پر ایک نظر ڈالی۔ وہ ہنسنے لگا۔

''چھوڑو! یہ مغرور ہونے کا وقت نہیں۔ لڑکی کے متعلق کیا خیال ہے؟''

''ہونہہ؟''

''لڑکی؟ خاص چیز ہے کہ نہیں؟''

''شرم کرو۔''

''کیوں؟''

''جسے پیچھے چھوڑ آئے ہو؟''

وہ سیٹی بجاتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

میں ڈولفن دیکھتے ہوئے سورج کے آسمان پر کافی اوپر آنے تک عرشے پر رہا۔ وہ ہمارا پیچھا کرتے ہوئے ڈھٹائی کے ساتھ جہاز کو دم لگا رہی تھیں۔ سمندر کی جھریوں والی جلد جو سورج کی روشنی کی وجہ سے پھیکے سبز رنگ کی ہو گئی تھی، سورج کی روشنی کو واپس منعکس کر رہی تھی کہ یہ لاکھوں ٹکڑوں میں ٹوٹا ہوا آئینہ ہو۔

میں واپس جہاز کے پیٹ میں گیا۔ زمرد ابھی تک باتیں کر رہی تھی۔ غازی جو اس کی

بیٹی کا دوست بن چکا تھا، اُس (بیٹی) کے گھٹنوں کے ساتھ جڑ کے بیٹھا ہوا تھا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ اِن حالات میں میری کوئی بھی رائے توجہ حاصل نہیں کر سکے گی، میں نے اُنھیں نظر انداز کر دیا۔ غازی اور دوسرے لوگ میرے اِس ردِعمل سے خوش ہوئے۔ معاملات کے اِس طرح رہنے پر میں خوش تھا۔ مجھے کم از کم اپنے منہ اور سگریٹوں کی فکر نہیں تھی۔

میں واپس عرشے پر چلا گیا۔

دوسرا دن بھی ایسے ہی گزرا۔

جیسے ہی غازی نے کہا کہ اُسے بھوک لگی ہے، ماں اور بیٹی نے چادر بچھا کر اس کے لیے کھانا لگا دیا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ماں زیادہ پر جوش تھی۔ غازی کو شروع کرنے کے لیے کہنے کا انتظار نہیں تھا، وہ جال بچھائے جا رہا تھا۔

جہاں تک اُس ایک بازو والے آدمی کا تعلق ہے جسے عورت ''میرا خاوند'' کہتی تھی، وہ واقعی کافی خاموش تھا۔ جب ضرورت ہوتی، وہ زمرد کو غسل خانے تک لے کر جاتا، کھانا لگانے اور بعد میں برتن اٹھانے میں مدد کرتا۔ اس کے علاوہ وہ سارا دن وہاں بیٹھا زمرد کی باتیں سنتا رہتا۔

ہم دوسرے مسافروں کے ساتھ زیادہ گھلے ملے نہیں۔ زیادہ تر مسافروں کا سفر طویل نہیں تھا اور وہ سوار ہونے کے جلد بعد اُتر گئے۔ کسان، دکان دار......

سفر کی تیسری رات جب ہم ایک چھوٹی سی بندرگاہ پر رکے تو ایک جوان آدمی جہاز پر چڑھا۔ اُس کا رنگ پکا، جسم کسرتی، وہ خوش شکل تھا اور مہارت سے ہارمونیکا بجاتا تھا۔ اس نے چارلیسٹن، کاکشین اور مغربی اناطولیہ کے لوک ناچ مہارت کے ساتھ ناچے۔ اُس کے آنے سے جہاز کے پیٹ کا ماحول بدل گیا تھا۔ ہماری طرح وہ بھی اپنے مقدر کی تلاش میں استنبول جا رہا تھا۔ اُس نے چالاکی کے ساتھ کسی طرح ٹکٹ حاصل کر لیا تھا اور اپنی دوست کو پیچھے چھوڑ کر قسمت کو تلاش کرنے نکل پڑا تھا۔

''اگر میں لازمی عسکری تربیت کے لئے چلا گیا'' اُس نے...... حسن نے ہمیں بتایا۔ ''تو یہ اچھا ہوگا۔ اگر ایسے نہ ہو سکا تو گالاٹا میں نوزلٹ نامی میرا ایک دوست ہے۔ وہ کوئلہ نکالنے کا کام کرتا ہے۔ مجھے اُس کے پاس جا کر وہیں رہنا پڑے گا۔ وہ میرا خیال رکھے گا۔''

''تم نے لازمی عسکری تربیت کہا ہے؟ ہم بھی وہیں جا رہے ہیں......''

''تم لوگ بھی؟ واقعی؟ مجھے اُمید ہے کہ اِس مرتبہ......''

''اِس مرتبہ؟''

''پانچ سال...... پانچ سال ہونے کو آئے، میں تقریباً ہر سال وہاں جاتا رہا ہوں، داخل ہونے کی سعی میں لیکن بے سود......''

''......؟......''

''میں بیچاری عمر رسیدہ ماں کے ساتھ رہتا ہوں۔ مجھے والد کے متعلق کچھ بھی یاد نہیں۔ بظاہر وہ ماہی گیر تھا۔ ہمارے گلی کوچے کے لڑکوں کو عموماً اپنے باپوں کے متعلق زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔''

''کیوں؟''

''وہ سارا سال مچھلیاں پکڑنے جاتے ہیں۔ چناں چہ ایک صبح وہ چلے جائیں اور شام کو لوٹ کر نہ آئیں تو کسی کو حیرت نہیں ہوتی۔ ہمارے علاقے میں ہماری ماؤں کو ہمارے باپ بھی ہونا ہوتا ہے۔''

زمرد اور اُس کی بیٹی اُس دن مالٹے کے جھنڈوں میں واقع ایک خوب صورت بندرگاہ پر اتر گئے۔ غازی لوہے کے جنگلے پر جھکا اس طرف دیکھ رہا تھا جدھر وہ گئے تھے گو اُنھیں گئے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔

میں نے اُسے کندھے سے ہلایا۔

''اور اب؟''

اُس نے آہ بھری۔

''ایک سگریٹ دو!''

میں نے جلد بجھائے ہوئے سگریٹوں میں سے جو میں نے خصوصی طور پر اُس کے لیے رکھے تھے، اسے ایک دیا۔

''تم اسے کیا کہو گے؟''

میں نے وضاحت کی۔ وہ ہنسنے لگا۔

''بہت خوب ساتھی۔'' اُس نے کہا۔ ''اب ہم ہر چیز کے لیے تیار ہیں۔''

''اور وہ لڑکی؟''

''اُسے بھول جاؤ۔''

''واقعی؟ کیوں؟''

''مجھے لڑکی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، میری تمام تر توجہ اُس کی ماں کے سگریٹوں اور کھانے پر تھی۔ یہ معاملہ اتنا ہی تھا۔''

''کنگال ہونے کی فکر مت کرو'' حسن نے کہا۔ ''یا بھوکے رہنے یا اسی طرح کی کسی اور حالت میں رہنے کی۔ اگر حالات نازک ہو گئے تو بوائلر والے کمرے میں بھٹی میں کوئلہ تو ڈال سکتے ہیں۔ لیکن نوبت یہاں تک نہیں پہنچے گی۔ ہم تاجروں کو سامان لادنے اور اتارنے میں مدد دے سکتے ہیں۔''

وہ درست کہتا تھا۔ ہمیں بیلچے سے کوئلہ ڈالنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ راستے میں ہم تاجروں کا سامان لادتے اور اُتارتے رہے۔ ہم زیادہ کما تو نہیں رہے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم بھوکے مر بھی نہیں رہے تھے۔ پھر ایک دن، جو ہمارے سفر کا نواں دِن تھا، ہم طویل ہارن کی کڑکڑاتی آواز سے جاگے۔

''ہم پہنچ گئے ہیں۔'' حسن نے کہا۔

ہم بھاگ کر عرشے پر گئے۔ جہاز گالاٹا میں لنگر انداز ہو رہا تھا۔

استنبول باریک سی دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ ہمارا رخ گالاٹا پل کی طرف تھا۔ ٹرامیں ادھر اُدھر چل رہی تھیں اور فاصلے سے چیونٹیوں کی طرح نظر آنے والے لوگ اِن میں اتر چڑھ رہے تھے۔ بندرگاہ کے گندے پانی میں مال بردار کشتیوں اور سٹیمروں کی بھیڑ تھی۔ آوازوں کا غل شور دھوئیں کے کمبل اور کوئلے کی بو میں داخل ہو رہا تھا۔

''میں نے کبھی......'' غازی نے تعجب سے کہا۔ ''میں نے کبھی......''

''کیا مطلب؟''

''میرا مطلب ہے کہ یہ استنبول ہے۔ استنبول! اُس خوبصورتی کو دیکھو!''

حسن ہمیں اپنے دوست کوئلہ مزدور نوزلٹ کے گھر لے گیا۔ خمیدہ ناک والا نوزلٹ اوپر سے نیچے تک کالا ہوا ہوا تھا اور اس کی آستینیں کہنیوں تک اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ دانتوں کی دو چمکتی ہوئی قطاریں دکھاتے ہوئے وہ مسکرایا۔

''چوں کہ تم لوگوں کے ٹھہرنے کے لیے کوئی جگہ نہیں'' اُس نے کہا۔ ''تم لوگ شوق سے یہاں رہ سکتے ہو۔''

پھر اُس نے سفید پنیر اور چند اُبلے ہوئے انڈوں کے ساتھ ہمیں روٹی پیش کی۔

''میں تم لوگوں سے معذرت چاہوں گا'' اُس نے کہا ''مجھے اپنے کام پر پہنچنا ہے۔ میرا کمرہ حاضر ہے۔''

یہ ایک تنگ اور چھوٹا سا کمرہ تھا۔ فرش، پیاز کے چھلکوں اور را کی خالی بوتلوں سے اٹا ہوا تھا جب کہ ایک طرف گندے برتنوں کا انبار لگا تھا۔

''میرے دوست کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے؟'' حسن نے پوچھا۔ ''جیسے میں نے کہا تھا نا......؟''

اُس نے چار ڈرائنگ پنوں سے دیوار پر لگائی گئی ایک خوب صورت عورت کی تصویر کی طرف اشارہ کیا:

''وہ اِس عورت کے ہاں رہا کرتا تھا۔'' اُس نے وضاحت کی۔ ''تاوقتیکہ اُسے یہ خوفناک بیماری لگ گئی۔ کوئی اور ہوتا تو اُس کتیا کو جان سے مار دیتا۔ اِس کے برعکس اُس نے اُس (عورت) کا اپنی جیب سے علاج کرایا اور جب وہ صحت مند ہو گئی تو اُسے چلتا کیا۔ دوبارہ اُس کی شکل نہیں دیکھی۔ ہمارا نوزلٹ اچھا لڑکا ہے۔''

استنبول میں دیکھنے کو اتنا کچھ ہے کہ ہمارے جیسے لوگ حیرت زدہ ہو گئے۔

اپنے تمام تر عجائب کے باوجود استنبول اُس نوجوان کے کس کام کا جس کی جیب میں صرف ساٹھ کوروس ہوں؟

ہم تینوں کاراکوئے کی طرف چل پڑے۔ بنکالر روڈ پر گھومتے ہوئے بیاگلو تک گئے۔

غازی کی آنکھیں حیرت سے کھلی ہوئی تھیں، اس کی زبان گنگ تھی۔

اُس دِن ہم نے استنبوال کی سیر کی، روایتوں کا وہ حیران کن شہر۔ ہم اتنے سحر زدہ تھے کہ اپنی دوستوں اور گیڈیکلی اکادلی کے متعلق بھول گئے۔ ہم حواس باختہ کر دینے والی خوب صورت عورتوں میں سے جو ہم دیکھ رہے تھے، کسی ایک کے لیے بھی مرنے کو تیار تھے۔

(VI)

آخرِ کار ہم استنبول کے عجائبات سے سیر ہو گئے۔ اِس کی وجہ ہماری بھوک تھی اور خوب صورت نظارے ہمارا پیٹ نہیں بھر سکتے تھے۔ وُہ وقت آن پہنچا تھا کہ ہم کوئی کام تلاش کریں۔

ہاں، کام!

لیکن کہاں؟

جہاں تک کہا جا سکتا ہے، ہم آزاد لوگ تھے۔ ہم کارخانہ لگانے کے لیے یا استنبول کے کسی بھی ریستوران میں جا کر جو چاہیں آرڈر کر لیں، کے لیے آزاد تھے۔ لیکن ہم کارخانہ نہیں لگانا چاہتے تھے یا مثال کے طور پر ٹوکاٹنین میں کھانے کا آرڈر نہیں دینا چاہتے تھے۔ میرے خیال میں ہمیں اِس آزادی سے فائدہ حاصل کرنے کا طریقہ ہی نہیں آتا تھا۔

ایک دِن جب ہم بھوک کے مارے ہوئے بے مقصد گھوم رہے تھے تو عسکری میں ہمارا سیمل کے علاوہ کسی اور سے سامنا ہو سکتا تھا! آپ کو یاد ہے...... جس نے لفافے کی ٹکٹ کے پیسوں سے کولڈ ڈرنک خرید کر خط ڈاک میں نہیں ڈالا تھا؟

شور کرتے ہوئے ایک دوسرے کو اِس طرح گلے لگاتے ہوئے کہ راہ گیر بھی ہمیں حیرت سے دیکھنے لگے! پھر ہم نے ایک دوسرے کو اپنے واقعات سنائے۔

اُسے پچھلے برس عسکری طبیعت کا داخلہ مل گیا تھا۔ ہم نے جاننا چاہا کہ کیا ہمارے لیے وہاں داخل ہو جانا ممکن ہو گا؟ اُس نے افسردگی کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ بہت سارے لوگوں نے

درخواستیں دے رکھی تھیں۔ اِس بات کے بعد ہمارے لیے اُتنے ہی مواقع تھے جتنے کسی اور کے لئے۔

''بات سنو، لڑکو۔'' اُس نے کہا 'میمٹ یاد ہے، چھبیس سالہ بوڑھا؟''

''ہمارا کپتان؟''

''ہاں، وہی...... وہ یہاں بے گوز میں ہے۔ وہ ایسے نائٹ کلب میں کام کرتا ہے جس میں ایک ریستوران ہے۔ وہ اچھی جگہ ہے۔ اگر تم لوگ یہاں کام کرنے آئے ہو تو اُس کا بوس تمھیں بے کوز شو فیکٹری میں کام لے کر دے سکتا ہے۔ فیکٹری کے فورمین اور دوسرے لوگ وہاں کھانا کھاتے ہیں۔''

''یہ سب بعد کی باتیں ہیں دوست۔'' غازی نے کہا ''یہ احمق بات کرنا مناسب نہیں سمجھتا لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہم نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔ ہم صحیح طرح سوچ ہی نہیں سکتے دوست، تمھاری جیب میں کتنے پیسے ہیں؟''

سیمل نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔

''زیادہ نہیں۔ میں تم لوگوں کو روٹی اور پنیر لے کر دے سکتا ہوں......''

''اور سگریٹ کی ڈبیہ۔ میں صرف ٹوٹے پیتا رہا ہوں۔''

''جب یہ بات ہو رہی ہے۔'' میں نے لقمہ دیا ''کوفی کا پیالہ ایک دعوت ہوگی۔''

''چھوڑو، سگریٹ اور کوفی کو بھول جاؤ۔ ٹھیک؟''

''یقین کرو، سیمل، ہم سگریٹ اور کوفی کو نہیں بھول سکتے۔''

اگلے دن ہم سیمل کے ساتھ نتھی ہوئے رہے اور بے کوز گئے۔

جب ہم وہاں پہنچے تو سیمل ہمیں ایک چھوٹے سے ریستوران میں لے گیا جو سڑک کے کنارے سرگوشیاں کرتے ہوئے درختوں کے درمیان میں واقع تھا۔

''یہاں کھانا کمال کا ہوتا ہے۔'' اُس نے اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔ ''ہم کہیں بیٹھ جائیں۔''

''سو، یہاں کھانا کمال کا ہوتا ہے......'' غازی نے سرگوشی کی ''دیکھو، مجھے دوبارہ پیٹ

بھر کے کھانے سے منع نہ کرنا۔ میں جتنا کھا سکتا ہوں، کھاؤں گا۔''

''تم کیسے آدمی ہو؟ تم اُنھیں ہماری مدد کرنے کے بارے میں محتاط کر دو گے۔''

''میں نے اُنھیں ایسے کیوں کر کر سکتا ہوں؟ میں تمھارے رویے سے تنگ آ چکا ہوں! کسی قسم کی مداخلت مت کرنا۔ میں نے خوب کھانا ہے!''

ہم اپنی اپنی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ سیمل، میمٹ کو بلا لایا۔ وہ ہمارے سامنے تھا، ہمارے پڑوس کی فٹ بال ٹیم کا کپتان۔ ہمیں دیکھ کر پہلے تو وُہ سکتے میں آ گیا اور پھر خوش ہوا۔ پھر اُس کی حسِ مزاح جاتی رہی۔ اُس کا خیال تھا کہ ہم مشہور زمانہ فینر بیس کو فٹ بال کھیلتے دیکھنے اور پیسہ خرچ کرنے آئے ہیں۔ لیکن ہم تو کام حاصل کرنے کی بات کر رہے تھے۔ اُس نے سمجھایا کہ ہم دوست تو ضرور تھے لیکن وہ ریستوران کا مالک نہیں تھا۔ وہ اتنا تو کما رہا تھا کہ کھا پی سکے۔ اُس کا بوس عجیب قسم کا آدمی تھا۔

نہیں۔ وہ ہمیں ادھار نہیں کھانے دے گا۔ بے کوز شو فیکٹری میں کام، ہم ناممکن کو ممکن بنانا چاہتے ہیں۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ پھاٹک کے باہر کیا حالات ہیں۔ کام ڈھونڈنے والوں کی قطاریں لگی ہیں، ہمارے جیسے لوگ نہیں، کاریگر موچی جن کے کبھی اپنے کاروبار تھے!

میں نے غازی کی طرف دیکھا اور اُس نے میری طرف۔ غازی کی مٹھیاں اُس کی کمر پر تھیں اور کانپ رہی تھیں۔ سیمل ہمیں وہاں لے کر آنے پر پچھتا رہا تھا۔

''سنو۔'' اُس نے ہماری وکالت کی۔ ''اِن کو دونوں کے لیے ہی رکھ لو۔''

''ایمان داری کی بات کرتے ہوئے ہو سیمل۔'' میمٹ نے کہا ''میں ایسے نہیں کر سکتا۔ اگر ریستوران میرا ہوتا تو ظاہر ہے کوئی مسئلہ نہیں ہونا تھا...... جہاں تک بوس کا تعلق ہے، وہ بال مکو کے زمانے سے میرا دوست سمجھا جاتا ہے۔ لیکن تمھیں اندازہ نہیں کہ وُہ کس طرح کا آدمی ہے۔''

غازی نے، جو رونے کے قریب تھا، مجھے بازو سے پکڑ لیا۔

''چلو، ہم جا رہے ہیں۔''

اُس نے دور پہاڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

''ٹھیک ہے، اُس طرف چلے جاؤ۔''

''لعنت ہو تم پر!'' سیمل نے کہا ''اپنے آپ کو دوست کہتے ہو؟ اپنے آپ کو انسان کہتے ہو؟ تم ادانہ میں فاقوں پر تھے جب ہم نے تمہاری مدد کی تھی۔ اگر ہم نہ ہوتے تو......سب کچھ بھول گئے ہو؟''

''اوہ، سیمل! میں کچھ بھی نہیں بھولا۔ خدا تم سب پر مہربان رہے، میں کیسے بھول سکتا ہوں؟ تم لوگوں نے ہمیشہ میری مدد کی لیکن......''

''لیکن اور کچھ نہیں۔ جاؤ اور اپنے بوس کے ساتھ بات کرو۔ ابھی؟''

میمٹ نے تھوک نگلا اور ریستوران کے پچھلے حصے کی طرف جا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''ٹھیک!'' غازی نے کہا ''وہ کہاں ہے؟ میں اس کے ساتھ بات کرتا ہوں۔''

میمٹ نے بھیڑ والی میز کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ ہماری طرف پیٹھ کیے کھڑا ہے۔ سفید قمیص والا، ٹرے اٹھائے ہوئے۔''

غازی آگے کی طرف چل پڑا، سیمل اور میں اُس کے پیچھے تھے۔

غازی اُس آدمی کو ایک طرف لے گیا۔

''دیکھیں جناب۔'' اُس نے وضاحت کی ''ہم آپ کے اُس فضول قسم کے ویٹر کے دوست ہیں۔ ہم ادانہ سے آئے ہیں۔ ہم بے روزگار ہیں اور ہمارے پاس پیسے بھی نہیں، سچ تو یہ ہے کہ ہم فاقوں پر ہیں۔ کیا آپ ہمیں جگہ دے سکیں گے۔''

آدمی نے ہمیں سر سے پیروں تک دیکھا۔

''تم لوگوں نے اتنا طویل فاصلہ اس لیے طے کیا ہے کہ تمھارے خیال میں وہ اِس جگہ کا مالک تھا۔''

غازی نے اُسے تفصیل سنائی۔ آدمی قہقہہ لگا کر ہنسا۔

''سو، تم لوگوں نے سن رکھا تھا کہ استنبول کی گلیوں میں سونا جڑا ہے؟''

اُس نے میمٹ کو بلایا تو وہ بھاگتا ہوا آیا۔

''دیکھو۔'' اُس کے بوس نے کہا ''یہ یہاں اِس لیے آئے کہ اِن کے خیال میں تم اس جگہ کے مالک ہو۔ اِنھوں نے سن رکھا تھا کہ استنبول کی گلیوں میں سونا جڑا ہے۔ تم اِنھیں یہاں سے

کیوں بھیج رہے ہو؟''

میمٹ شرما گیا۔

''حرکت میں آؤ۔'' اُس کے بوس نے کہا ''اِن کے بیٹھنے کے لیے کرسیاں لاؤ اور پینے کو کچھ پیش کرو۔ اب جب کہ ہم یہ خیرات کر ہی رہے ہیں تو کیوں نہ اُن کا خیال کریں! اوہ، غریب بھکاریوں کو کچھ کھلاؤ۔''

ہم کم تر محسوس کرتے ہوئے، شرم سار سے، کرسیاں اٹھا کر ریستوران کے پیچھے گھاس پر چلے گئے اور بیٹھتے ہی جھکنے لگے۔

''اپنے آپ کو پریشان نہ ہونے دینا۔'' میمٹ نے کہا ''وہ ہمیشہ ایسے ہی بات کرتا ہے۔ تم لوگوں کو اُسے مجھے بلاتے ہوئے سننا چاہیے۔''

ہم نے ظاہر کیا کہ ہمیں کوئی پروا نہیں۔ ہم گھنٹہ وہاں بیٹھے، پھر دو گھنٹے، پھر تب تک جب تک اندھیرا نہیں ہو گیا۔ ہم نے یورگی، کوفی شاپ کے احمد، مینڈیے اور فٹ بال کے اپنے میچوں کے متعلق باتیں کی کہ اگر ''کوفا'' احمد کرو پیر، بیرام کے بجائے کبیلہ سپور کے خلاف فائنل میں کھیلا ہوتا تو ہم شاید جیت جاتے اور اگر ''ڈاج'' علی کے بجائے غازی نے فری کِک لگائی ہوتی تو یقیناً جیت ہماری ہوتی اور نوری ''گروسر'' کیسے ہمیشہ فیس دیا کرتا تھا لیکن ایک میچ بھی نہیں کھیل سکا تھا۔

غازی نے مذاق مذاق میں سیمل کی ٹوپی کو چھیڑا۔

''بے کار قسم کے آدمی! یاد ہے کہ تم نے ٹکٹ کے پیسوں سے ٹھنڈی بوتل خرید لی تھی؟''

''ہاں۔ وہ کیا دن تھے! خیال رہے کہ میں پیاس کے مارے مر رہا تھا۔''

''تمھاری وجہ سے ہمیں پوری رات پیدل چلنا پڑا تھا؟''

''یورگی نے اپنی کلائی کی گھڑی بیچ دی تھی، یاد ہے؟ بے چارہ یورگی!''

''وہ چھان بورے کی دکان چلانے کے دنوں میں بہتر تھا......ابھی تو وہ کپڑے کے کاروبار میں آ کر بہت امیر ہو گیا ہے۔''

''واقعی؟ اُس نے اپنے چچا کی بیٹی کے ساتھ شادی کر لی؟ صائم کی کیا خبر ہے؟''

''اِس سال اُس نے ہائی سکول پاس کر لینا ہے۔ وہ قانون کے پیشے میں جانا چاہتا ہے۔ اُس کا ارادہ جج بننے کا ہے۔''

''اور ڈاج علی؟ صالح؟ کبڑا رجب؟''

''تم کُبڑے رجب کے بارے میں جاننا نہیں چاہو گے؟''

''کیوں! کیا ہوا؟''

''وہ وفات پا چکا ہے؟''

''سچ؟''

''بھیانک منظر تھا، بے چارہ لوطی...... جب اُس کی لاش ملی تو وہ کیڑوں سے بھری ہوئی تھی۔''

اندھیرا چھا رہا تھا اور ہم خاموش بیٹھے ہوئے پتوں کی سرسراہٹ اور دور آبنائے باسفورس میں چلتے ہوئے جہازوں کے ہارن کی آوازیں سن رہے تھے۔

''حسن حسین کی کیا خبر ہے؟'' میمٹ نے پوچھا ''کیا وہ اکاؤنٹنٹ بن گیا ہے؟''

''نہیں۔ لیکن بنے گا ضرور۔''

''ضرور۔''

میمٹ بے ہودہ سی ہنسی ہنسا۔

''ہنسنے کی کیا بات ہے؟''

''مجھے ابھی یاد آیا کہ اُس نے پھلوں کے مرکب سے کیسے اپنی جیبیں بھری تھیں......''

''اور پھر ہمارے کپتان کے سگریٹوں والا معاملہ......''

''اور اُس دن اُس نے ہمیں کباب کھلائے؟''

''وہ کیا دن تھے۔'' غازی نے سوچتے ہوئے کہا ''ایک دن منہ میں کھانا ٹھنسا ہوا اور اگلے دن فاقہ......''

سیمل آخری فیری پر سوار ہو کر چلا گیا۔

''کیا تم حقیقتاً یہ بتانا چاہتے ہو کہ اِس حجم کے شہر میں دو آدمی نہیں سما سکتے۔'' میں نے

کہا۔

میمٹ نے آہ بھری۔

''مجھے اِس غربت سے نفرت ہے۔ دیکھو، میں امیر آدمی نہیں ہوں۔ ساتھیو، میرا یقین کرو کہ میں امیر آدمی نہیں ہوں۔ لیکن میں کیا کر سکتا ہوں! میرے دو دوست بہت دور سے آئے ہیں اور مجھے اِس قابل ہونا چاہیے تھا کہ اُنھیں گھمانے لے جا سکوں۔ میرا مطلب ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے کرنا چاہیے لیکن میں یہاں بُری طرح الجھا ہوا ہوں۔ میرے پاس اور کوئی چارہ ہی نہیں......''

میں نے غازی کا تاثر اپنی آنکھ کے کونے سے دیکھا۔ میں اپنے پیچھے چلتے ہوئے لوگوں کی آواز سن سکتا تھا اور درختوں کے نیچے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے بچوں کے کھنکھناتے ہوئے قہقہے بھی۔

میمٹ کا بُوس، ہمیں پتا چلے بغیر، ہمارے پاس پہنچ گیا۔

''خوب'' اُس نے کہا ''تم لوگوں کو استنبول میں نوکری مل جائے گی، کمائی کرو گے اور اپنی دوستوں کو بلاؤ گے؟ رہنے کے لیے تمھیں معقول سی جگہ کی ضرورت ہو گی۔ اِس کے علاوہ، سب سے ضروری بات ہے کہ لوگوں کو الگ الگ تجوری کی ضرورت ہو گی...... یہ بہت ضروری ہے تا کہ بچائی ہوئی رقم وہاں رکھی جا سکے۔''

کمر پر ہاتھ رکھے وُہ ہمارا مذاق اُڑا رہا تھا۔

''اگر'' اُس نے بات جاری رکھی ''تم لوگوں کو کبھی باورچی یا مشعلچی کی ضرورت ہو تو ہمیں اطلاع کر دینا۔ میمٹ اور میں تمھارے لیے کوشاں رہیں گے۔''

بات کرتے ہوئے وہ ہنسے جا رہا تھا۔ وُہ چل پڑا اور پھر رک گیا۔

''ریستوران میں ایک بالا خانہ ہے۔'' اُس نے بات جاری رکھی ''جسے تم مہمان خانہ کہو گے، یہ وہ تو نہیں لیکن گدے پر سونا بُرا ابھی نہیں ہو گا۔ موسم گرما ہے اِس لیے چادر کی ضرورت نہیں ہو گی، صرف لال بیگ اور چوہے بہت ہوں گے۔ ممکن ہے وہ کچھ بدتمیز ہو جائیں اور اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو اپنے کان ڈھانپ کر رکھتا۔ میرے خیال میں وہاں بال آیا ایک آئینہ بھی

ہے جسے جھاڑ کر تم استعمال کر سکتے ہو۔ میرے خیال میں یہ کبھی کسی آرمینائی نواب کی ملکیت تھا۔ وہ اِسے صبح کے غسل کے لیے استعمال کیا کرتا تھا۔ صرف مشکل ہے کہ وہاں عکس صحیح طرح نظر نہیں آتا۔ قدرے ٹیڑھا ہو گیا ہے اور شاید اُس کا زنگار بھی اُترا ہوا ہے۔ گو یہ کسی رئیس کی ملکیت تھا اور اب یہ کسی کام کا بھی نہیں رہا پھر بھی اس کی اہمیت اپنی جگہ قائم ہے۔ کیا خیال ہے؟''

ہم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ لطف اٹھاتے ہوئے، ہنستے ہوئے، چلا گیا۔

پھر اُس نے میمیٹ کو بلا کر اُس کے ساتھ کوئی بات کی۔

دریں اثناء غازی اپنی غربت کو کوس رہا تھا کہ اُسے یہ سب برداشت کرنا پڑا۔

(VII)

اگلی صبح میمیٹ ہمارے پاس آیا۔

''میں استنبول جا رہا ہوں۔'' اُس نے کہا ''میں گلاٹا میں نوزلٹ سے ملوں گا اور تم لوگوں کا سامان بھی لے آؤں گا۔ اُس کے لیے خط کیوں نہیں لکھ دیتے تا کہ اُسے دے دوں؟''

میں نے مختصر سا ایک پیغام لکھ کر اُس کے حوالے کر دیا۔

جب وہ واپس آیا تو بہت خوش نظر آ رہا تھا، مشکوک سا خوش۔

''میں وہاں پہنچ گیا۔'' اس نے وضاحت کی ''میں نے نوزلٹ کو ڈھونڈ کر تمھارا خط دیا۔ اُس نے خط پڑھا۔ پھر اُس نے کہا۔ ''انھیں کہنا کہ سامان کے متعلق پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، وہ یہاں ہی پڑا رہ سکتا ہے۔ میں خیال رکھوں گا۔ وہ جب واپس آئیں تو لے سکتے ہیں۔''

اُس رات میمیٹ نے ہمارے لیے ضیافت کا اہتمام کیا جس میں ڈولما، سلاد اور راکی تھی۔ وہ جلد ہی نشے میں آ گیا اور رونا شروع کر دیا۔

''مجھے دیکھو۔'' اُس نے کہا۔ ''میں بُرا آدمی نہیں ہوں، تم لوگ جانتے ہو کہ میں بُرا نہیں لیکن یہ غربت......''

وُہ اپنے بازو میرے گلے میں ڈال رہا تھا، پھر اُس نے غازی کو گلے لگایا اور پھر واپس میری طرف......

ہم نے کھانا کھایا، شراب پی، سمندر کے کنارے پارک مین بیٹھ کر گزرتے جہازوں کو

دیکھا، تاروں کے متعلق اپنے علم کی ساجھے داری کی، فحش عورتوں کے بارے میں پُرشہوت رائے زنی کی اور آخرکار علی الصبح سونے کے لیے گئے۔ جب ہم جاگے تو سورج ہمارے گرد آلود آئینے سے منعکس ہو رہا تھا۔

''میمٹ کی رات والی کیفیت سے تم نے کیا اندازہ لگایا؟'' غازی نے پوچھا۔

''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔'' میں نے کہا ''مجھے حسن حسین کا کباب آرڈر کرنا یاد آ گیا۔ میمٹ کے ہاتھ کوئی خزانہ نہیں لگ گیا، کچھ ہوا ضرور ہے...... یقیناً ہمیں پتا چل جائے گا۔''

اور ہمیں یقیناً پتا چل گیا۔

ریستوران میں ایک اور دن اور ہم نے محسوس کیا کہ ہمیں کام ملنے کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ دن گزر گیا اور رات گئے میمٹ اپنے بُوس کے ساتھ ڈولما بھر رہا تھا۔ ڈولما کی خوشبو سارے میں پھیل گئی۔ ہم نے سارا دن کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ ہم تازہ مصالحے کی خوشبو میں سانس لے رہے تھے اور ہمارے ساتھ بینگنی رنگ والے ڈولما پلیٹوں میں سجے ہوئے تھے۔

''میں بیس ڈولما کھا سکتا ہوں۔'' غازی نے اعلان کیا۔

''شیخی مت بھگارو۔''

''میں سنجیدہ ہوں۔''

آنکھ جھپکے بغیر ہم پلیٹوں کو دیکھتے رہے۔

''بعد میں...... ہم چپکے سے وہاں تک رینگ کر آ سکتے ہیں......'' اُس نے کہا۔

''پھر کیا ہوگا؟''

''ہم نمائش والے برتن کے اوپر سے پلیٹ اٹھا لیں گے......''

''پھر؟''

''صرف ایک ایک کھائیں گے......''

''کیا ایسے کر سکو گے؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔ تم؟''

''میں؟ ممکن نہیں۔''

غازی نے استنبول کو گالی دی۔

''کیا لعنتی جگہ ہے۔ میری ماں اگر مجھے اس حالت میں دیکھنے کے لیے زندہ ہوتی......! میری حالت دیکھو۔ میں دو ڈولما کھانے کے لیے کتنی اذیت میں ہوں۔''

''میرے متعلق کیا خیال ہے؟''۔ میں نے یاد کرایا۔ ''میں ایک واقعہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ ایک کھانے کے دوران میں میرے بھائی نیازی نے چھترے کی چانپوں پر ناک سکیڑی تھی۔ والد نے اسے وُہ کھانے پر مجبور کیا اور وہ قے کرتے ہوئے بھاگ گیا۔ ہمارے ہاں گوشت کے لیے کھال اترا پورا جانور، مکھن بڑے تھیلوں میں اور پنیر بڑے کنستروں میں پہنچایا جاتا تھا......''

''ارے، وہ احمق ہمیں بیوقوف بنا رہا ہے۔''

''کون؟''

''میمٹ کا بُوس۔''

''اوہ! اگلے دن والی بکواس؟ اگر ہمیں باورچی کی ضرورت ہوئی وغیرہ......''

''اور وہ...... ہمیں اپنی بچت سنبھالنے کے لیے تجوری کی ضرورت پڑے گی۔ میرے خیال میں بھرے ہوئے ڈولما تو مناسب نہیں ہوں گے۔ کیا خیال ہے؟''

''ایسے ہی لگتا ہے۔ ہے نا؟''

''لیکن اگر اُن کے اندر بھرائی زیادہ ہوئی...... میرا مطلب ہے کہ اگر سب کھائے گئے تو ضائع نہیں ہوں گے......''

جب کام مکمل ہو گیا تو تھوڑی سی بھرائی بچ گئی تو میمٹ اور اُس کے بُوس کے لیے ایک ایک چمچ بنی۔ پھر اُنھوں نے سنبھالنا شروع کر دیے۔

میں نے اپنے ہونٹ کاٹے، غازی نے گالی دی اور کھانسا۔ اُنھوں نے اوپر دیکھا تو ہم عین وقت پر پیچھے ہٹ گئے۔

''احمق سوئے ہوئے ہیں؟'' اُس نے پوچھا۔

میمٹ نے سر ہلایا۔

''کیا ہم احمق ہیں؟'' غازی نے سرگوشی کی۔

"پتا نہیں۔ میرے خیال میں تو نہیں ہیں۔" میں نے بھی سرگوشی کی۔

"تم اپنے دوست سیمل کو بتاؤ" آدمی نے بات کی۔ "کہ وہ اِس طرح کے بیکار لوگوں کو اکٹھے کرکے یہاں پھینکنا بند کرے اور اِن فضول لوگوں کو بتاؤ کہ کل یہاں سے دفع ہو جائیں۔"

میمٹ نے اپنا سر جھکا لیا۔

"مجھے احساس ہے۔" آدمی نے کہا "استنبول ایک بڑا شہر ہے۔ مفلسی ایک لعنت ہے، گلیوں میں خالی جیب پھرنا تکلیف دہ ہے۔ میں محسوس کرسکتا ہوں کہ بہت تکلیف دہ ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم کن حالات میں سے گزر رہے ہیں۔...... میں نے تمھیں بوہر سے ملنے کو کہا تھا، ملے اُس سے؟"

"حساب کتاب مکمل کرنے کے لیے؟ ہاں، اُس سے ملا تھا۔ اُس نے معذرت کی تھی اور یقین دلایا کہ ایک آدھ دن میں ادائی کردے گا۔"

"ایسے ہی ہوتا ہے! ہم جس کے پاس جائیں یا تو ادائی دو دنوں میں ہوگی یا مہینے کے آخر میں۔ ہم نے خود بھی دس ہزار سے اوپر دینا ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ ہم یہ سب کیسے پورا کریں گے۔ جاؤ اور اُن لوفروں سے کہہ دو کہ کل انھوں نے جگہ خالی کردینی ہے۔ میں کوئی خیرات دینے والا نہیں۔ خدا نے جو پیٹ دیے ہیں وہ انہیں بھرے بھی!"

اس کے بعد ایک طویل خاموشی تھی۔

غازی نے اپنی دھنسی ہوئی آنکھوں کے ساتھ میری طرف دیکھا اور ہم ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے وہاں بیٹھے رہے۔

اگلی دن میمٹ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ہم نے شائستگی کے ساتھ شہر جانے کے لیے کرایہ مانگا۔ اُس نے ظاہر کیا کہ اُسے ہمارے جانے کے ارادے سے مایوسی ہوئی۔

"میرے متعلق بُری رائے مت قائم کرو۔" اُس نے کہا "میں بُرا آدمی نہیں ہوں۔ آخر کار میں تو صرف......"

'اس کا بوس بھی آ گیا، متجسس۔

"کیا ہو رہا ہے؟" اُس نے پوچھا "جانے کی تیاری؟ کسی قسم کا کام ملنے تک تمھیں

ٹھہرنا چاہیے تھا۔ تم لوگ کیا کرو گے؟ کچھ فیصلہ ہوا؟"

ہم نے اُسے بتایا کہ ہم نے کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ غازی اور میں نے نظروں کا تبادلہ کیا۔ کشتی کے سفر کے لیے کرائے کی کافی رقم لینے کے بعد ہم بندرگاہ پر چلے گئے۔

ہم استنبول واپس چلے گئے اور گالاٹا میں نوزلٹ کو ڈھونڈ نکالا۔ وہ ہمارے سامنے تھا، طوطے کی چونچ نما ناک اور موتیوں جیسے دانت۔ تب ہمیں تمام حالات کا علم ہوا۔

"چھوٹے قد کا آدمی، بٹنوں جیسی آنکھیں، ڈاڑھی مونچھ منڈی ہوئی...... یہاں آیا اور اُس نے تمھارا خط مجھے دیا۔ میں نے تم لوگوں کا سامان اُسے دے دیا۔ پھر وہ چلا گیا۔"

غازی غصے میں تھا، وہ گالیاں دے رہا تھا اور لعنتیں بھیج رہا تھا۔ میرے حواس جواب دے گئے۔ نوزلٹ نے ہمیں غور سے دیکھا اور سیٹی بجاتے ہوئے کھڑکی کی طرف چلا گیا۔ پھر اُس نے میز پر پڑے بڑے سے ٹماٹر کو اٹھایا۔

"سو" اُس نے بات جاری رکھی۔ "وہ تم لوگوں کے پاس تمھارا سامان لے کر نہیں گیا؟"

"نہیں......"

"اب کیا کرو گے؟ تمھارے پاس بستر نہیں اور کپڑے بھی نہیں......"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

اس نے پھر ہمیں سر سے پاؤں تک دیکھا۔

"یہ مجھے کہانی کے دوسرے سرے تک لاتا ہے۔ مجھے تمھارا خط ملا، میں تم لوگوں کے ساتھ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ مجھے اُس آدمی کی آنکھ پسند نہیں آئی...... میں نے اُسے سامان تو دے دیا مگر اُس کا پیچھا کیا۔ وہ باہر نکل گیا اور میں بھی۔ قصہ مختصر، وہ تم لوگوں کا سامان لے کر سڑک کی اگلی طرف ایک یہودی کے ہاں گیا اور سامان وہاں رکھ کر کہیں چلا گیا۔ میں سیدھا یہودی کے پاس گیا اور اُسے بتایا کہ یہ سامان چوری کیا گیا ہے اور پولیس کسی وقت بھی پہنچ سکتی ہے۔ یہودی پر غشی طاری ہوگئی۔ بہر حال تمھارے دوست نے سامان کو دس لیرا کے عوض گروی رکھ دیا تھا۔ میں نے یہودی کو رقم کی ادائی کرکے سامان واپس لے لیا۔ سب کچھ نچلی منزل پر پڑا ہے اور جب چاہو اُسے اٹھا سکتے ہو۔"

غازی اور میں خوشی سے پاگل ہو گئے۔ ہم نے نوزلٹ کو گلے لگایا اور چوما......

''تم لڑکوں کو ابھی تک ملازمت نہیں ملی ہے۔'' اُس نے کہا ''تم لوگ اپنا سامان ابھی لے سکتے ہو یا اگر مناسب سمجھو تو یہاں چھوڑ سکتے ہو۔ میرا مطلب ہے کہ دس کا نوٹ اتنا اہم نہیں ہے۔ چناں چہ تم لوگوں کے پاس جب بھی فالتو نقدی ہو......''

میں نے اپنی سب سے چھوٹی پھوپھی سے پیسے مانگنے کا سوچا۔ چناں چہ میں نے اپنی حالتِ زار بیان کرتے ہوئے اُسے خط لکھا۔ میں نے بتایا کہ میرے ساتھ ایک دوست تھا اور درخواست کی کہ مجھ فوراً کچھ رقم بھیجے۔

نوزلٹ نے خط خود سپرد ڈاک کیا۔

ہم جب اُس پیسے کے انتظار میں تھے جو ہمیں یقین تھا کہ جلد آئے گا، ہمارے پاس بے مقصد گھومنے، دکانوں کی کھڑکیوں میں جھانکنے، آرام دہ کاروں میں سے جو گزرتی تھیں اپنے لیے منتخب کرنے اور کون سی کار بہتر ہے کی فضول سی بحث میں اُلجھنے کے علاوہ کوئی اور کام نہیں تھا۔ غازی نے مشورہ دیا کہ جب رقم آئی تو ہم پیٹ بھر کر مرغن کھانا کھائیں گے۔

''قطعاً نہیں۔'' میں نے کہا ''روٹی، پنیر اور تھوڑا سا پھل۔ اُس پیسے کو ہم جلد ختم نہیں کریں گے۔''

''تمھاری پھوپھی کا خاوند ایک امیر آدمی ہے؟''

''خاصا......!''

''کیا وہ لوگ تمھیں پسند کرتے ہیں؟''

''کیا تو کرتے تھے......''

''کافی؟''

''میرا اندازہ تو یہی ہے۔ تم ترکی کے سب سے بڑے ڈاکٹر بنو گے۔ وہ کہا کرتے تھے۔ چناں چہ میں اُن لوگوں کو ضرور پسند ہوں گا۔''

''پھر پریشان ہونے کی بات نہیں۔ کیا ہے؟ میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ وہ تمھیں ایک سو......''

''ایک سولیرا؟''

''یقیناً! اُنھیں تمھاری ضرورتوں کا احساس ہوگا اور اِس بات کو بھی مدِنظر رکھیں گے کہ تمھارے ساتھ ایک دوست ہے۔ کیا خیال ہے؟''

''شاید......لیکن شاید نہ بھی ہو۔''

''شاید نہ بھی ہو، مت سوچو! اُنھیں تمھارا احساس ہوگا!''

''......؟''

اِس تمام گفتگو کے دوران میں ہم بیازت میں فوارے کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ ایک گرم، روشن دِن تھا اور استنبول خوب صورت لگ رہا تھا لیکن ہم بھوکے تھے!

''سچ پوچھو،'' میں نے کہا۔ ''تمام ریستورانوں کا ایک اور چکر لگانا اچھا خیال ہوگا۔''

''صبر کرو'' غازی نے کہا۔ ''اُن کی نیک نیتی پر شک نہ کرو۔ دیکھو، نوزلٹ ہمیں گھر سے تو نہیں نکال رہا۔ صرف دو اور دن ہمیں تکلیف اٹھانا ہوگی، پھر دیکھنا کہ کیا ہوتا ہے......''

''تم وہاں تب تک رہنا چاہتے ہو جب وہ ہمیں باہر نہ نکال پھینکے۔ تم ادانہ میں تو ایسے نہیں ہوا کرتے تھے۔''

''میں اب بھی ویسا ہی ہوں......صرف اب ذرا مشکل میں ہوں۔ ہیں کہ نہیں؟''

ایک آوارہ آدمی پاس سے گزر رہا تھا۔ اُس نے سڑک کے پار کسی جاننے والے کو آواز دی۔

''میٹروسیلی۔'' اور وہ سڑک پار کر گیا۔

''ایک منٹ صبر کرو۔'' میں نے غازی سے کہا۔ ''تمھیں یاد ہے کہ کریٹن کے کہنے پر ہم نے ایک آدمی کو دوست بنایا تھا۔ سپاہی، نجیب......وہ نجیب میٹروسیلی تھا۔''

''ہاں، تھا تو سہی۔ سپاہی، نجیب۔ اُس کا پتا کیا تھا؟''

''مجھے یاد پڑتا ہے...... میٹروسیلی، نجیب۔ وہ کھاڑی میں کام کرتا تھا۔ گولڈن ہارن......''

''ٹھیک ہے۔'' غازی نے میرا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ''آؤ چلو!''

ہم چل پڑے۔ آخر کار ہم نے کھاڑی ڈھونڈ نکالی۔ وہاں ہم نے تمباکو کے گوداموں کا

چکر لگایا۔ دوپہر کے کھانے کے وقفے تک ہم نے نجیب کو ڈھونڈ نکالا۔ اُس کے جسم پر بھورے رنگ کی ایک گندی سی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ اُس کے جسم میں سے تمباکو کی بُو اٹھ رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہ مجھے گلے ملا، پھر اُس نے غازی کو گلے لگایا اور پھر مجھے۔ پھر وہ گودام میں گیا اور تھوڑی دیر کی چھٹی لے کر آیا۔ وہ ہمیں گودام سے ملحقہ ایک ریستوران میں لے گیا اور ہمیں پیٹ بھر کر کھانے کو کہا۔

''میں نے اب کام پر واپس جانا ہے۔'' اُس نے کہا۔ ''کھانا ختم کرنے کے بعد میرا یہاں انتظار کرنا۔ واپس آ کر بات کروں گا۔ کھانے کے پیسے دینے کی ضرورت نہیں۔''

غازی بات ختم ہونے سے پہلے ہی بیٹھ گیا تھا۔

''کھڑے کھڑے وقت مت ضائع کرو۔'' اُس نے کہا۔ ''بیٹھو اور ہم پیٹ بھریں۔''

اُس نے بے صبری کے ساتھ پلیٹ پر کانٹا بجانا شروع کر دیا۔

''ہمیں زیادہ خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔'' میں نے مشورہ دیا۔ ''کیوں کہ......''

''تنگ مت کرو۔ میں بہت بھوکا ہوں۔ مجھے صحیح طرح نظر بھی نہیں آ رہا۔ ویٹر! بات سنو...... اِدھر، یہ ویٹر سوئے ہوئے ہیں۔ ویٹر...... یہاں......''

ویٹر ہمارے پاس آ گیا۔

''سب سے پہلے۔'' غازی نے کہا۔ ''میرے لیے ٹھنڈے ڈولما لاؤ۔ نہیں ٹھہرو...... میں گرم ڈولما لوں گا...... لیکن یقین کرنا کہ شیف بڑی جسامت والے دے۔''

ویٹر دبی دبی سی ہنسی ہنستے ہوئے چلا گیا۔

''تم کیوں گھور رہے ہو؟'' غازی نے مجھ سے پوچھا۔ ''میں پورے ہفتے کا کھانا کھانے لگا ہوں۔ تمھیں اس سے کیا ہے؟ نجیب کو کیسے پتا چلا کہ ہم بھوکے ہیں؟ کیا ہم فاقہ زدہ نظر آتے ہیں؟ اسے ہی تو دوستی کہتے ہیں! ایک نظر اور وہ جان گیا کہ ہم بھوکے ہیں۔ اُس پر رحمت ہو۔''

ویٹر اُس کے ڈولما لے آیا۔

''برائے مہربانی میرے لیے سوپ کا ایک پیالہ لا دیں۔'' مین نے کہا۔

نجیب کافی دیر کے بعد اپنی شفٹ کے اختتام پر آیا۔ گلیاں تمباکو مزدوروں اور اُن کی گفتگو سے بھری ہوئی تھیں۔ میں اُن زنگ آلود بھورے، گندے لیکن خوش مجمع کا حصہ بننا چاہوں گا۔

نجیب سوال پوچھتا، ہنستا اور خوش ہوتا رہا۔

''ہم جا کر چند میچ دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں کچھ میچ اتنے عمدہ ہوتے ہیں کہ تمھیں یقین ہی نہیں آئے گا۔ تم لوگ کون سے کلب میں شامل ہونا چاہو گے؟ میرے خیال میں فینر بچ بہتر رہے گا۔ غور کرو کہ فینر بچ......''

غازی اور میں مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے۔

''تم لوگ کون سے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہو؟'' ہم کوفی کے ان گنت پیالے پی چکے تو نجیب نے پوچھا۔ ''کیا وہ صاف ستھری جگہ ہے۔''

غازی نے مجھے آنکھ ماری۔

''بہت صاف۔'' اُس نے کہا۔

''تم لوگ آج کی رات میرے ساتھ ٹھہر جاؤ۔ آؤ...... چلیں...... ہوٹل میں اطلاع کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''ضرورت تو نہیں۔'' غازی نے کہا اور پھر کھل کر ہنسنے لگا۔ ''کون سا ہوٹل، دوست؟ ہم ہوٹل میں کیسے رہ سکتے ہیں؟ ہم خوش قسمت تھے کہ لیٹنے کے لیے ہمیں ایک فرش مل گیا!''

''کس کے فرش پر لیٹتے رہے ہو؟''

''وہ زندہ رہنے کے لیے بیلچے کے ساتھ کوئلہ بھرتا ہے۔''

''میرا بھی کچھ ایسا ہی خیال تھا۔'' نجیب نے بات شروع کی اور پھر خاموش ہو گیا۔

اُس نے چلنا شروع کر دیا اور ہمیں پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

اُس نے جو بھی سوچا ہو گا مگر وہ اچھا مہمان دار ثابت ہوا۔

ہم چند گلیوں میں سے گزرتے، کچھ موڑ مڑتے، ٹائیلوں کی چھتوں اور سمندر کی طرف کھلنے والی کھڑکیوں کے پُرہجوم علاقے میں سے گزرنے کے بعد لکڑی کے بنے ہوئے اُس کے خاندان کے چھوٹے سے گھر میں داخل ہو گئے۔ وہ ہمیں اپنے بیٹھنے والے کمرے میں لے گیا۔ گھر

سائے میں ہونے کی وجہ سے ٹھنڈا تھا۔ سفید رنگت والی عورت کا اِدھر اُدھر لہراتا عکس، پہلے کمرے کے ایک سرے میں اور پھر دوسرے سرے میں، نظر کے سامنے سے گزرتا۔

دیوان کے سرپوش اور بیٹھنے والے کمرے کے پردوں پر سبز، گلابی اور جامنی رنگوں میں نفاست کے ساتھ کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ دیواروں پر بھاری فریموں میں سجائی گئی عربی تحریروں کے علاوہ کوئی تصویر آویزاں نہیں تھی۔

سالہا سال سے پالش کرنے کی وجہ سے فرش کے پھٹے پیلے پڑ گئے تھے۔ مجھے کھڑکی میں سے پہاڑی کا ایک حصہ، جہاں قبرستان تھا، نظر آ رہا تھا۔

ہم نے نجیب کی بوڑھی والدہ کے جھریوں والے ہاتھوں کو احترام کے ساتھ چوما۔ اُنھیں ترک زبان پر معمولی سی دسترس تھی۔ اُنھوں نے خوش اخلاقی سے ہمیں سوالات کیے اور ہم نے موزوں جواب دینے کی کوشش کی۔ اندھیرا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ نجیب کی بہن جو تمباکو کمپنی کے گودام میں کام کرتی تھی، کمرے میں آئی۔ اُس کے کانوں میں نیلے رنگ کی بالیاں تھیں اور گھنگریالے بالوں کو ڈھکا نہیں ہوا تھا۔

''خوش آمدید۔'' اُس نے کہا اور اندر جا کر برتن رکھنے والی میز پر بڑا گلابی لیمپ جلایا اور چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد نجیب کے والد جن کی مونچھیں سیاہ تھیں، پلاسٹر کے چھینٹوں سے بھرا چچا اور بڑا بھائی، جس کے بارے میں ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ترکھان ہے، ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ اُن کے ہاتھ بھاری اور کھردرے تھے اور وہ ہمارے ساتھ ٹوٹی پھوٹی ترکی میں بات کر رہے تھے۔ میرے خیال میں وہ حیرت انگیز لوگ تھے، خاص کر نجیب کے والد۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے تحکمانہ انداز میں اپنی مونچھوں کو درست کرتے جاتے اور وقتاً فوقتاً گالیاں بھی دیتے۔ اسی اثنا میں نجیب کی بہن نے فرش پر کھانا کھانے والی چادر بچھا دی، نیپکن کے طور پر استعمال کرنے کے لیے فلالین کے ٹکڑے رکھ دیے اور روٹیوں والا ڈبہ لے آئی۔ جب وہ یہ کام کر رہی تھی تو لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی کھیل کھیل رہی ہو، بیچ بیچ میں وہ مسکرا بھی رہی تھی اور مسکراتے میں اس کا سونے کا دانت لشکارے مار رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ کس کے لیے مسکرا رہی ہے، میرے لیے یا غازی کے لیے؟

جب ہم کھانا کھا چکے، کوفی پی چکے، غیر اہم باتوں پر تبادلہ خیال کر چکے تو ہم نجیب کی بہن کے لگائے ہوئے بستروں پر لیٹ گئے۔ ہمارے بستر ساتھ ساتھ لگائے گئے تھے۔ بستر بے داغ تھے، چادروں پر کئی جگہوں پر ہنرمندی سے پیوندکاری کی گئی تھی اور اُن میں صابن کی خوشبو تھی۔

ہم اپنے بستروں میں گھس گئے۔

''آہ......'' میں نے آہ بھری۔ ''یہ زبردست ہے!''

غازی نے اپنا سر اوپر اٹھایا۔

''کون؟'' اُس نے پوچھا۔ ''تمھارا مطلب لڑکی سے ہے؟ میں اس کے ساتھ فوراً منگنی کرنے کے لیے تیار ہوں!''

میں اُس پر بہت بگڑا۔

''تم بے اصول آدمی ہو......''

''قطعاً نہیں، بے اُصول تو تم ہو۔ میں جانتا ہوں کہ میں نے اگر تیزی نہ دکھائی......''

''کیا مطلب؟''

''چھوڑو، میں نے خود تمھیں اُسے بُری نظروں سے دیکھتے ہوئے دیکھا ہے۔''

اگلی صبح ہم نے شان دار ناشتہ کیا اور گلاٹا کی طرف نکل گئے۔ اِس طرح دن گزر گیا۔

''تمھاری پھوپھی کے بھیجے ہوئے پیسے آ جائیں......'' غازی نے اگلے دن کہا ''ہم نجیب کو باہر کھانا کھانے کی دعوت دے سکیں گے۔''

''ہاں، یہ مناسب رہے گا۔ ہم اُسے کھانے کے لیے کہیں باہر لے جائیں گے۔''

''کسی اچھی سی جگہ پر۔ ہم راکی اور Mege کے ساتھ اُس کی خاطر تواضع کریں گے۔''

''ہم نوزلٹ کا ادھار بھی اُتار دیں گے۔''

''ظاہر ہے۔ ہمیں اُسے بھی باہر کھانے کی دعوت دینا ہوگی۔''

''ہمیں ایسے کرنا چاہیے۔ نجیب کے ساتھ اُسے کسی ریستوران میں لے جانا چاہیے۔''

''ہمیں راکی کی دو بوتلوں کا آرڈر کرنا چاہیے۔''

''اگر مجھے ڈیڑھ سو کے قریب مل گئے تو پھر کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔''

"تمھاری جگہ اگر میں ہوتا تو پریشان نہ ہوتا۔ تمھاری پھوپھی کو کم از کم اتنے تو بھیجنے ہوں گے۔ کیوں کہ وہ جانتی ہے کہ تمھارے ساتھ اُس کا ایک دوست بھی ہے۔"

اُس شام نوزلٹ نے مجھے وہ خط تھما دیا جس کا مجھے کئی دنوں سے انتظار تھا۔ میں نے جلدی سے لفافہ کھولا۔ غازی اور میں نے جھک کر جلدی سے مختصر سا خط پڑھا۔

میں نے اپنے نام نہاد دوست کو وہیں چھوڑ کر فوراً وہاں جانا تھا۔ مجھے بس کا کرایہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں، صرف اپنے پھوپھا کا نام بتانا تھا۔ مجھے کب عقل آئے گی کہ اپنے ساتھ ہر آوارہ گرد اور مفت خورے کو لیے پھرتا ہوں!

غازی کا رنگ بدل گیا۔ میں نے خط پھاڑ کر چھوٹی کھڑکی میں سے باہر مچھلی کی خوشبو میں پھینک دیا۔ ہم نے پہلے میرے کپڑے بیچے اور پھر سوٹ کیس۔

"استنبول انوکھا شہر ہے!"

آپ چھلانگ لگا کر ٹراموں میں سے باہر کود سکتے ہیں، ٹیکسیوں میں سوار ہو سکتے ہیں، جسے چاہیں اپنی پسند کے ریستوران میں کھانا کھلا سکتے ہیں...... آپ فیکٹری لگا سکتے ہیں یا بے روزگار رہ سکتے ہیں، یا بینک کھول سکتے ہیں...... جو بھی آپ کرنا چاہیں!

"استنبول انوکھا شہر ہے!"

پھر کیا ہوا؟

پہلے ایک کام کیا پھر دوسرا۔ ہم نے گولاٹا میں کئی کیفوں میں ویٹر کا کام کیا، کوئلہ کو بیلچے سے منتقل کیا، گلیوں میں سامان بیچا اور کبھی کبھار بے کار قسم کے مقامی کلب کی طرف سے فٹ بال کھیلا...... یہ تمام صرف ایک وقت کے کھانے کے لیے۔

استنبول انوکھا شہر ہے!

آخر کار ایک صبح، نیم فاقہ کشی کی حالت میں، ہم نے پل، کو ٹراموں کو، گندے سمندر کو، گیلاٹا کو الوداع کہا اور تمام خوب صورت عورتوں کو استنبول کے مردوں کے لیے چھوڑ کر واپس وطن جانے کے لیے سمندری جہاز پر سوار ہو گئے۔

الوداع استنبول!

(VIII)

ادانہ پہنچنے کے بعد اگلی رات ہی ہم حسن حسین سے ملے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ میری دوست ایک ملاح کے ساتھ دوستی کر گئی تھی۔ غازی کی نے اپنے ایک کزن کے ساتھ، جو قریبی گاؤں میں کھیت مزدور تھا، منگنی کر لی تھی اور کریٹن کیفے کے مالک کو منشیات کے سلسلے میں پولیس نے پکڑ لیا تھا اور وہ سزا کاٹ رہا تھا۔

"کیسا لگا؟" غازی نے سوچتے ہوئے کہا "یقین کر سکو گے؟"

جہاں تک میرا تعلق تھا......

"کیا سوچ رہے ہو؟" حسن حسین نے مجھ سے پوچھا۔

"اس کی فکر نہ کرو۔" غازی نے کہا۔ "یہ کبھی موقع ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتا۔ مجھے اس کے مسئلے کا تو علم نہیں...... اِن معاملات پر ہمیشہ انحصار نہیں کیا جا سکتا......"

میں جب غازی اور حسن حسین سے جدا ہوا تو آدھی رات ہو چکی تھی۔ میں اُس مصری توت کے پاس گیا جہاں ہم تیلیاں جلا کر اپنی دوستوں کو اشارے کیا کرتے تھے۔ بوڑھا درخت صبر کے ساتھ انتظار کر رہا تھا، وہ مقدر سے سمجھوتا کیے ہوئے لگا۔ میں نے اُس کے ساتھ ٹیک لگا لی۔ کچھ فاصلے پر میں نے دو روشن کھڑکیاں دیکھیں۔ وہ ویسے ہی نظر آئیں جیسے ہم اُنھیں چھوڑ کر گئے تھے۔ میں نے اونچی سیٹی بجائی۔ میں نے ایک کھڑکی پر سایوں کو آواز سننے کے لیے رکتے ہوئے دیکھا۔ دوسری سیٹی نے وہاں بے چینی سی پیدا کر دی۔ پھر، سایوں میں سے ایک صوفے پر

چڑھ گیا۔ لیمپ نے اشارہ کیا۔ ''آئی۔'' میرا چہرہ کھچنا شروع ہوگیا اور میرا بایاں کان اچانک بجنے لگا۔ میں نے سوچا کہ وہ کس طرح رونا شروع کر کے معافی مانگے گی...... وہ اپنے کرتوتوں کی کیا وضاحت کرے گی؟ کیسے؟ میں نے سوچا، کیسے؟

وُہ وہاں پہنچ گئی اور ''خوش آمدید'' کہے بغیر میرے سامنے کھڑی ہوگئی۔ کچھ دیر ہم خاموش کھڑے رہے۔

''کیا یہ سچ ہے؟'' میں نے پوچھ ہی لیا۔

وہ خاموش رہی۔

''تو یہ سچ ہے؟''

وُہ خاموش رہی۔

''تمھاری اُس کے ساتھ ملاقات کیسے ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

وُہ پھر بھی خاموش رہی۔

''مجھے نا اُمید ہوجانا چاہیے؟''

اُس نے سر اٹھا کر تاروں کی طرف دیکھا اور پھر چھاتی کے سامنے اپنے ہاتھ باندھ دیے۔

''وُہ کسی طرح بھی تمھارے ساتھ میرے جتنی محبت نہیں کر سکتا۔'' میں نے کہا ''تم اپنے فیصلے پر پچھتاؤ گی۔ یقین کرو، تم پچھتاؤ گی۔''

اُس نے کندھے اُچکائے۔

میں نے بجے ہوئے سگریٹ کو دور پھینکا اور واپس چل پڑا۔

واپس سڑک پر میں بجلی کی روشنیوں میں چل پڑا، میرے کانوں میں پہرے داروں کی اکا دکا سیٹی آ رہی تھی۔ جیسے ہی ایک موڑ مڑا، کسی نے پیچھے سے نزدیک آ کر میرا بازو پکڑا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، یہ حسن حسین تھا۔

''کیا یہ بکواس اب ختم ہوگئی ہے؟'' اُس نے پوچھا۔

میں اپنے آپ کو ''ہاں'' کہنے کے لیے تیار نہیں کر سکا۔

''سنو! میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ کیا یہ بکواس اب ختم ہوگئی ہے؟''

''سنو......''

''دیکھو دوست! اب ''اگر''، ''مگر'' کی کوئی گنجائش نہیں۔ تمھیں اپنے آپ کو سنبھالنا ہوگا۔ یا تو تم سکول جاؤ گے یا کوئی باعزت ملازمت کرو گے۔''

''ماچس ہوگی؟''

میں نے سگریٹ سلگا لیا۔

(IX)

''مجھے گلی کے آوارہ کتوں سے تم سے زیادہ عقل کی اُمید رکھنی چاہیے۔'' میری دادی نے اعلان کیا۔

اگر میں اپنے دوست سے چھٹکارا حاصل کر کے پھوپھی کے پاس چلا گیا ہوتا۔ اس بے رحم دنیا میں ہر آدمی اپنے لیے سوچتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

غازی کو اُس کے باپ نے خوب مارا۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک آوارہ لڑکے کے ساتھ سکول سے بھاگ گیا تھا۔

تین دنوں کے بعد اُسے اپنے چچا کی آٹے کی مِل میں، جو نزدیک کے ایک گاؤں میں واقع تھی، کام کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ تقریباً دو ہفتوں کے بعد والدہ میری بہنوں کے ساتھ پہنچ گئیں۔ وہ والد کی طرف سے سخت احکام لائی تھیں۔

انھوں نے کہلا بھیجا تھا کہ مجھے سکول نہیں چھوڑنا چاہیے تھا اور مجھے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنا چاہیے۔

''او کے،'' میں نے کہا ''میں سکول جاؤں گا۔''

''او کے۔ میں سکول جاؤں گا!'' والدہ نے صدمے کی سی کیفیت میں کہا ''تم سکول نہیں جا رہے؟''

دادی نے بات چیت کی باگ ڈور سنبھال لی اور وہ بولتی رہی اور اپنی بات کا وہیں پر

اختتام کیا جہاں سے آغاز کیا تھا:

’’گلی کے آوارہ کتوں سے......‘‘

والدہ نے پریشانی سے میری طرف دیکھا۔

یہ میرے علم میں تھا کہ میرے آنے کے بعد والدین یروشلم میں نقل مکانی کر گئے تھے۔

جو والدہ بتا رہی تھیں اُس کے مطابق ’’وہ وہاں انتہائی غربت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ ایک خستہ حال بڑی ساری عمارت کے جو بدو قبیلے کے لوگوں سے بھری ہوئی تھی، ایک چھوٹے سے کمرے میں رہ رہے تھے۔ نیازی ایک دم طویل قامت ہو گیا تھا لیکن بہت دبلا تھا۔ وہ یروشلم کی گلیوں میں ٹرے پر سارا دن چھوٹی موٹی چیزیں بیچتا تھا، کاش وہ گلیوں میں بغیر روک ٹوک کے پھر سکتا۔ وہ فلسطینی نہیں تھا اور دوسرے غیر ملکیوں کی طرح اُسے برطانوی پولیس سے ہوشیار رہنا پڑتا تھا۔

ایک دفعہ ایک پولیس والے نے اُس کا پیچھا کیا۔ نیازی بھاگ پڑا اور پولیس والا اُس کے پیچھے بھاگا۔ اُسی وقت ایک ٹرام گزری، نیازی چھلانگ لگا کر ایک دروازے کے اندر اور دوسرے سے باہر کودتے ہوئے گر گیا۔ اُس کے ٹرے کے ٹکڑے ہو گئے، تمام سامان بکھر گیا، ہتھیلیاں زمین پر رگڑی گئیں اور اُس کے جسم کے زخموں سے خون بہنے لگا۔

والدہ یہ کہانی سناتے ہوئے ہنس رہی تھیں اور رو بھی رہی تھیں۔

’’زندگی ایک حیرت کدہ نہیں؟ ہم نے اُسے بہت احتیاط کے ساتھ، نازک پھول کی طرح، ہر کٹھنائی سے بچاتے ہوئے، پالنے کا سوچ رکھا تھا۔ اُس کی یہ عمر کام کرنے یا پیسے کی فکر کرنے کی نہیں ہے۔ اُسے سکول جانا چاہیے تھا۔ ایسا بھی نہیں کہ اُس سے چھوٹے لڑکے کام نہیں کر رہے ہوتے، لیکن اگر آپ کا خون اور گوشت ہو تو......‘‘

مجھے نیازی کا خیال آیا۔ ایک مرتبہ ہم بیروت والے گھر کے باہر فوارے پر بیٹھے رسی کے ساتھ ٹانگیں یہ طے کرنے کے لیے ناپ رہے تھے کہ کسی کی موٹی ہیں۔ دونوں کی ٹانگیں لمبی اور پتلی تھیں اور گھٹنے گومڑی دار تھے۔ میری ٹانگوں پر سنہری، چھوٹے چھوٹے بال تھے جب کہ اس کی ہلکے رنگ کی تھی۔

’’عربوں اور یہودیوں کے درمیان میں لڑائی کے کیا حالات ہیں؟‘‘

کوئی دِن ایسا نہیں تھا جب لوگ مارے نہ جائیں یا دکانوں کو آگ نہ لگائی جائے، خاص کر اُن دنوں جب کرفیو لگایا گیا ہو۔ ظاہر ہے ایسے دنوں میں وہ عمارت میں بے چینی سے اوپر نیچے چکر لگاتے رہتے۔ وہ ہر چیز اور ہر کسی سے برہم ہوتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ نیازی کرفیو سے ایک گھنٹے پہلے گھر پہنچ جائے۔ لیکن نیازی اپنا ٹرے اٹھائے ہوئے ہمیشہ اُس وقت آتا جب کرفیو شروع ہو چکا ہوتا یا ابھی شروع ہونے والا ہوتا۔ تب نیازی چپکے سے کمرے میں چلا جاتا۔

’’نیازی آپ کے ساتھ نہیں آنا چاہتا تھا؟‘‘ میں نے والدہ سے پوچھا۔

’’کیوں نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے تو پاسپورٹ بھی بنوا لیا تھا۔‘‘

’’پھر؟‘‘

’’آخری رات وہ اپنی بہنوں کے ساتھ ہنس کھیل رہا تھا۔ وہ اُنھیں بتا رہا تھا کہ ادانہ میں کیا کرے گا۔ میمت کا بھائی اسے دیکھ کر کیسے حیران ہوگا، وہ کس سکول میں جائے گا اور دوبارہ فٹ بال کھیلے گا۔ وہ اتنا خوش تھا! پتا نہیں کہ پھر اُسے کیا ہو گیا۔ صبح اُس نے اپنا ارادہ بدل لیا۔ اُس کے والد نے بھی اصرار کیا تھا......‘‘

مجھے وجہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ میری طرح انا پرست نہیں تھا۔

’’میں کچھ بھی کروں۔‘‘ میری والدہ نے کہا۔ ’’مجھے اُن لوگوں کو کچھ رقم بھیجنے کا بندوبست کرنا ہے۔‘‘

ہماری کچھ زمین تھی جو حکومت نے والد کے فرار ہونے کے بعد ’’انتظامی حفاظت‘‘ میں لے لی تھی اور اب وہ پڑوسی زمین داروں کے غیر قانونی قبضے میں تھی۔ والدہ اِن زمینوں کو واپس حاصل کرنے کی کوشش کرنے والی تھیں۔ اگر ضرورت پڑی تو وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گی۔ وہ پیمائش کرنے والوں کو لا کر زمین کی حدیں طے کریں گی اور آخر میں کسی کو کاشت کرنے کے لیے دے دیں گی۔

’’یہ اتنا آسان نہیں ہوگا۔‘‘ دادی نے کہا ’’تمہارے خیال میں، مَیں نے کوشش نہیں کی؟ سردیوں میں، طوفانوں میں، گھٹنوں تک کیچڑ میں...... پھر ایک مرتبہ...... میں اُس آدمی سے

ملی...... وہ عبدالفتح، گلستان کا خاوند یاد ہے؟ اُنھیں اب دیکھنا چاہیے، کیا شان دکھاتے ہیں! وہ تمباکو کے ٹکڑے کرنے آیا کرتا تھا۔ وہ ایسا آدمی تھا جس کے ساتھ بات کرنے کو بھی دل نہیں کرتا تھا۔ لیکن کیا کیا جا سکتا ہے؟ جب تک اپنا مقصد نہ پورا ہو جائے، اُنھیں خوش کرنا پڑتا ہے......

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے! میں نے اُسے خوب سنائیں، بد بخت کوتاہ قد آدمی، میں نے کہا کہ میرے بیٹے نے سلام بھیجا ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ میرے بیٹے نے کہا ہے کہ 'جاؤ اور عبدالفتح کو ڈھونڈو۔ وہ تمام بندوبست کر دے گا۔ وہ تمام زمین واپس کروا دے گا اور اپنی زمین کے ساتھ ساتھ اس پر بھی محنت کرے گا اور تمہارے تقاضا نہ کرنے کے باوجود تمھیں مناسب حصہ ادا کرے گا' میں نے جب یہ کہا تو وہ کونے میں دبک کر کھڑے، قابو کیے گئے سور کی طرح میری باتیں سنتا رہا۔

''محترمہ'' اُس نے کہا 'ہم سے اپنی زمین نہیں سنبھالی جاتی۔ ہمارے لیے کسی اور زمین پر کام کرنا ممکن نہیں ہوگا...... میں آپ کو نقصان پہنچانا نہیں چاہوں گا۔ جہاں تک مجھے علم ہے، آپ کے کھیت خالی پڑے ہوئے ہیں۔ اُن پر کاشت کرنے کے لیے آپ کو کسی اور کا بندوبست کرنا ہوگا۔'

''جناب!'' میں نے کہا ''پھر ہر کوئی یہ کیوں کہتا ہے کہ عبدالفتح اور اُس کا بھائی ہمارے کھیتوں کو سنبھالے ہوئے ہیں۔'

''تمھیں اُس کا ردعمل دیکھنا چاہئے تھا۔ وہ پھٹ پڑا، اُسے دورے پڑے لگے۔ ''میری معزز خاتون، میری بات سنیں'' اُس نے کہا اور میری طرف بڑھنے لگا......

لگتا ہے کہ دادی کو اُس کا ''میری معزز خاتون'' کہنا ناگوار گزرا۔ اب بیچاری میری والدہ کی قسمت آزمانے کی باری تھی۔

''میرے اختیار میں اور کچھ نہیں'' اُنھوں نے کہا ''مجھے اُس کے ساتھ بات چیت کرنا ہی ہوگی اور اگر ضرورت پڑی تو اُسے عدالت تک لے کر جاؤں گی...... خاندان انتہائی غربت کی حالت میں ہے۔'' پھر وہ میری طرف مڑی:

''نوجوان آدمی! تم اب سیدھا سکول جاؤ گے!''

(X)

والدہ نے زمین کے معاملات میں اپنے آپ کو بری طرح الجھا لیا۔ تحریریں، درخواستیں، وراثت کے کاغذات، قابض لوگوں کو نوٹس، قانون کی عدالتیں...... دن، ہفتے، مہینے گزر گئے۔ نتائج ہمیشہ نامکمل ہوتے اور والدہ تھکنا شروع ہو گئیں۔ وہ رات کو دیر سے گھر آتیں، سرکاری کاغذات کی موٹی فائل کو پھینکتی اور صوفے پر گر جاتیں۔ پیسے بچانے کے لیے ہم اندھیرے میں بیٹھتے۔ اُن کے سر کے بال ایک دم سفید ہو گئے اور دھنسی ہوئی آنکھوں کے ساتھ وہ ہمارے لیے ایک پریشان کن نظارہ تھیں۔

میرے جوتوں کے تلوں میں سوراخ تھے اور پتلون کی ٹانگیں گھسی ہوئی تھیں۔ کئی مرتبہ میں پانچ کُرس کے سکے کے بغیر ہی سکول چلا جاتا۔ والد کی سخت ہدایات کے باوجود، سکول کی پیلی لکیروں والی ٹوپی اور ناقابل یقین پاگل خانہ جو 3-B تھا، مجھے سکول جانا اتنا پسند نہیں تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ میرے اور سکول کے درمیان میں رشتہ کمزور پڑتا گیا۔

میں اب بچہ نہیں تھا۔ میرا بھائی اور والد قابل رحم غربت کا شکار تھے، اب سفید بالوں اور دھنسی ہوئی آنکھوں والی میری والدہ گھٹنے گھٹنے کیچڑ میں جدوجہد کر رہی تھیں اور میری بہنوں کا وزن لگاتار کم ہو رہا تھا، تو یہ واضح ہو گیا کہ سیکنڈری سکول کی تعلیم ایسی عیاشی تھی جس کے ہم متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے اِس کو جاری رکھنے کا کوئی حق نہیں۔

اچھے وقتوں میں ساتھ نبھانے والے دوست ہمیں چھوڑ گئے۔ لوگوں کو ہماری محبت میں

کوئی لطف نہیں رہا تھا اور ہماری گفتگو اُنھیں بے چین کر دیتی۔

''والد کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا اُن کا خیال تھا کہ وہ دنیا کی خرابیاں اکیلے ہی دور کر دیں گے؟ اُنھوں نے ہمیں کہاں تک پہنچا دیا ہے، صرف اجنبیوں کے لیے...... باہر تو ہر آدمی اپنا ہی بچاؤ کر رہا ہے......''

''میری توبہ!'' والدہ نے کہا ''تم بھول رہے ہو کہ تمھارے والد کتنے باعزت آدمی تھے۔ کچھ عرصہ پہلے تک اِس جیسے لوگ اُن کے سامنے گردن اوپر نہیں اٹھا سکتے تھے۔''

جو کچھ بھی کوئی کہتا، حقیقت یہ تھی کہ ہم پر بھاری زوال تھا۔ زندہ رہنے کے لیے ہمارے پاس کیا تھا؟ ہم اکیلے تھے۔ اردگرد کے لوگوں سے جنھیں ہماری پروا نہیں تھی ہم کٹے ہوئے تھے۔ وہ لوگ جو صرف کندھے اُچکاتے تھے اور صرف اپنے بارے میں سوچتے تھے۔ یقیناً اس کے کئی ثبوت تھے۔

اُنھیں دنوں میں سے ایک دن! جب کہ ہمارے پاس روٹی اور کالے زیتون تک نہیں تھے، جو غریب ترین گھروں میں نہ ملنے والی آخری چیز ہوتی ہے، والدہ ایک بہت قریبی رشتہ دار کے ہاں معمولی سا قرض لینے گئیں۔

''میں کم از کم دس لیرا مانگوں گی۔'' والدہ نے مجھ سے کہا۔ ''تاکہ میں روٹی اور تھوڑے سے زیتون خرید سکوں اور ممکن ہوا تو چائے اور چینی بھی۔ یہ کچھ عرصہ ہمارے لیے کافی ہوں گے۔ اس کے بعد دیکھیں گے کہ خدا کی کیا مرضی ہوتی ہے۔ میرے جانے کے بعد اگر لڑکیاں جاگ جائیں تو اُنھیں مصروف رکھنا۔ میں جلد از جلد واپس آنے کی کوشش کروں گی۔''

پچھلی رات ہم بھوکے سوئے تھے۔ والدہ کو واپس آنے میں دیر ہو گئی۔ لڑکیاں جاگ گئیں۔ اُنھوں نے مجھ سے والدہ کے متعلق پوچھا۔ میں نے اُنھیں بتایا کہ والدہ روٹی اور زیتون لینے گئی ہیں اور وہ کسی بھی وقت واپس آ سکتی ہیں۔ وہ بہت خوش ہوئیں۔ ہماری چھوٹی بہن نے جوش کے ساتھ تالی بجائی۔

''اوہ...... پیاری امی جان۔ مجھے سخت بھوک لگی ہے۔''

وہ ایک خاکستری، نم آلود صبح تھی۔ کچھ دیر پہلے موسلا دھار بارش ہوئی تھی اور سڑکوں پر

پانی کا دھارا سا چل رہا تھا۔

آخر کار والدہ لوٹ آئیں۔ اُن کے ہاتھ خالی تھے۔ وہ مکمل طور پر تھکی ہوئی لاچار نظر آئیں۔ اُنھوں نے آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنا شروع کیں۔ وہ اوپر تک آنے میں کامیاب ہوئیں۔ جیسے ہی اپنے کمرے میں داخل ہونے والی تھیں، وہ لڑکھڑائیں۔ اُنھوں نے دروازے کے چوکھٹے کا سہارا لیا۔

''پانی'' اُن کے گلے سے گھٹی ہوئی آواز نکلی۔ ''ایک گھونٹ پانی پلاؤ۔''

ہمارے پانی لے کر جانے سے پہلے ہی وہ دروازے کے آگے ڈھیر ہو گئیں۔

کیا ہو رہا تھا؟

لڑکیاں گھر کی مالکہ کو بلانے کے لیے دوڑیں۔ گھر کی مالکہ سفید سرپوش پہنے دعائیں پڑھتے ہوئے آئی۔ اُس نے والدہ کی کلائی اپنے ہاتھ میں لی۔

''یوڈی کلون'' اُس نے تقاضا کیا۔

ہمارے پاس نہیں تھا۔

''تھوڑا سا پھولوں کا عطر یا سرکہ''

''......؟''

''تھوڑا سا سرکہ بھی نہیں ہے؟''

''نہیں ہمارے پاس سرکہ بھی نہیں ہے۔ ہمارے پاس گھر نہیں، ہمارے پاس کار نہیں۔ ہماری جائیداد نہیں۔ ہمارے پاس زمین نہیں اور ہمارے پاس سرکہ بھی نہیں۔''

میری مٹھیاں مضبوطی کے ساتھ میرے کولہوں پر جمی ہوئی تھی۔ سرکہ نہ ہونا کیا کوئی سماجی ناکامی ہے؟

مکان کی مالکہ چلی گئی اور اپنا یوڈی کلون لے آئی۔ وہ والدہ کو ہوش میں لے آئی۔ والدہ نے گھبراہٹ میں چاروں طرف دیکھا۔ اُن کے خاکستری چہرے پر پریشانی تھی۔ پھر اُنھوں نے اپنے گھٹنے اوپر کی طرف کھینچے اور اپنا سر اُن پر رکھ کے بے قابو ہو کر رونے لگی۔ وہ روتی رہیں۔

گو ہم نے وجہ معلوم کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اُنھوں نے اپنے بے ہوش ہونے کا سبب نہیں

بتایا۔ ہمیں بہت بعد میں پتا چلا کہ جب وہ ہمارے رشتے دار، قریبی رشتے دار، کے پاس گئیں تو اُن کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ اُنھیں گھر کے اندر داخل ہونے کو بھی نہیں کہا گیا تھا۔ اُنھیں باہری دروازے پر روک کر گلی میں ہی پوچھا گیا کہ اُنھیں کیا چاہیے۔ اور اُس عورت...... قریبی رشتے دار، واقعی بہت قریبی رشتے دار...... نے کہا:

"کیا فائدہ؟ اِس کا کوئی انجام نہیں۔"

اُنھوں نے والدہ کو بتایا کہ والد کو سیاست میں نہیں اُلجھنا چاہیے تھا کہ زندگی میں ہر کسی کی اپنی اپنی ذمہ داریاں ہوتی ہیں، کہ والد کو اجنبیوں کی خاطر اپنے پیاروں کو اذیت میں نہیں ڈالنا چاہیے تھا۔

"گھر میں بچے بھوکے ہیں۔" والدہ نے منت کی۔ "میں ماضی کو کھودنا نہیں چاہتی۔"

"بہتر۔" اُس عورت...... قریبی رشتے دار، واقعی بہت قریبی رشتے دار...... نے کہا "تم بھی ماضی کو نہیں کھودنا چاہتیں۔ چلو پھر ہم اِس منحوس معاملے کو ختم کرتے ہیں۔"

اور اُس نے والدہ پر دروازہ بند دیا۔

(XI)

جب مجھے اِس بات کا پتا چلا تو منہدم ہونے کے قریب ہمارا کمرہ میرے اردگرد گھومنے لگتا۔ کیا میں اُس عورت کے پاس جاؤں جس نے کتاب بند کی تھی اور اُس کے محل سرا کو جلا دوں، اُس کے بیٹے کو ماروں یا اُن کے دروازے پر جا کر کوئی سکینڈل بنا دوں۔ کیا میں یہ سب کر سکتا تھا؟

شاید۔

لیکن، میں نے اپنے آپ سے پوچھا: نتیجہ کیا ہوگا؟ اِس سے کیا حل نکلے گا؟

شاید ایک محل سرا جل جائے، کسی بچے کی پٹائی ہو جائے یا خاتون اپنے کیے کی وجہ سے شرمندہ ہو جائے۔ پھر کیا ہوگا؟ نتیجہ تو منفی ہی ہونا تھا۔ "سٹیٹس کو" قانون کا اپنا نقطۂ نظر ہے اور وہ چٹان پر کھڑے، مکّے لہراتے ہوئے نوجوان کے ساتھ ہمدردی نہیں کرے گا۔

میں نے محسوس کیا کہ چٹان پر کھڑے ہو کر مکّے لہرانا بے مقصد ہوگا......

غازی اپنے چچا کے کارخانے میں کڑی نگرانی میں تھا۔ حسن حسین کامرس کالج کے تیسرے سال میں تھا اور میں سکینڈری سکول میں 3_B میں۔

لڑکیاں 3-A میں تھیں اور سب سے بڑی مشکل سے سولہ برس کی تھی۔ 3-B میں ہمارے ساتھ، ہیملٹ، صائم، پایپ ضیا، بلیک صدری، ممتاز ریچھ، گُر دسرمد جیسے لوگ تھے اور ہم میں سب سے چھوٹے اتنے بڑے تھے کہ اگر اُن کی شادی ہو جائے تو اُن کے ہاں بچے پیدا ہو جائیں۔

میں جب اردگرد دیکھتا تو ممتاز ریچھ، تختۂ سیاہ پر تاریخ کے اُستاد کا کیری کچر بنا رہا ہوتا

جب کہ کردسرمد اُس کے پیچھے کاغذ کی دم لگا دیتا۔ تمام کلاس ہنسنے اور شور کرنے لگتی اور ممتاز ریچھ سمجھ جاتا۔ جب وہ دم لگانے والے کو بُرا بھلا کہہ رہا ہوتا تو کرُدسرمد نے ہنسنے کی وجہ سے درد کرتے ہوئے پیٹ کو پکڑا ہوتا اور وہ ممتاز ریچھ کی سزا سے بچنے کے لیے باہر بھاگ جانے کو تیار ہوتا۔ جیسے ہی ممتاز ریچھ نے محسوس کیا کہ اِس کا کون ذمے دار ہے...... ہمیں خود کو بچانے کے لیے ڈیسکوں کے اوپر سے بھاگنا پڑتا اور تمام جماعت ایک ہنگامے میں الجھ جاتی۔ شور، قہقہے، ڈیسکوں کو پیٹنا اُس وقت تک جاری رہتا جب تک آہستہ سے دروازہ کھلتا اور وہاں غصے سے بھرا ہوا بھاری جثہ ہیڈ ماسٹر کھڑا ہوتا۔ افراتفری ایک دم ختم ہو جاتی۔ کلاس احترام کی تصویر بن جاتی اور چہروں سے مسکراہٹیں غائب ہو جاتیں۔

ہیڈ ماسٹر کلاس پر نظر دوڑاتے ہوئے ہم سب کے چہروں کو غور سے دیکھتا:

''مجھے اب یہ فیصلہ کرنا ہوگا۔'' وہ کہتا ''کہ کیا یہ طالب علموں کی جماعت ہے، جانوروں کا باڑا یا مجرموں کا ٹھکانہ۔ میں تم لوگوں کو یہ تنبیہ کر رہا ہوں کہ تم لوگوں سے نمٹنے کے لیے مجھے وہی طریقہ اپنانا پڑنا ہے جو اُن کے لیے ہونا چاہیے۔''

لیکن ہمارے ساتھ ایسا سلوک کبھی نہیں کیا گیا...... کم از کم تب تک نہیں جب تک میں وہاں تھا۔

میں نے اپنی کلاس کے ایسے تماشوں میں کبھی حصہ نہیں لیا تھا...... میں نے اپنے آپ کو اُن کا حصہ محسوس نہیں کیا۔ میں والدہ، بہنوں اور خاص کر ٹرام سے اُترتے وقت لڑکھڑا کر گرنے کے بعد چھلے ہوئے گھٹنوں والے اپنے چھوٹے بھائی نیازی کے متعلق سوچتا رہتا۔ اگر میرے خاندان کے افراد وہاں بے پناہ غربت میں تھے اور بقیہ یہاں بے پناہ غربت میں تھے تو مجھے لگتا کہ یہ سکینڈری سکول میرے لیے ناقابل قبول عیاشی ہے۔ تعلیم کو خوراک پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ میں اپنے کندھوں پر اس ذمے داری کے بوجھ کو پڑتے ہوئے محسوس کر سکتا تھا اور یہ احساس روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ سکینڈری سکول کا ڈپلومہ مجھے کیا دے گا؟ اگر کاغذ کا یہ ٹکڑا مجھے مل بھی جائے...... اور اُن دنوں میں سکینڈری سکول کا ڈپلومہ ملازمت کے لیے یقینی گارنٹی تھا...... لیکن اتنا بیوقوف کون ہوگا جو ''ایک ملک بدر کے بیٹے'' کو اپنے محکمے میں ملازمت دے؟

مجھے کام کرنا ہی پڑے گا، لیکن کون سا۔

کیا میں کپڑا بُننے والے کام پر واپس چلا جاؤں؟ یا تعمیراتی جگہوں پر مزدوری شروع کر دوں؟ کیا میں کپاس کے کھیتوں میں کمر دوہری کرنے والی کھیت مزدوری کروں یا اُس جلا دینے والے سورج کے نیچے؟

مجھے لگا کہ سب سے آسان کام پھل فروش بن جانا تھا۔ خربوزے، تربوز اور انگور بیچنا۔ یہ مجھے اچھا لگا۔ موسم کے مطابق میں خربوزے، مالٹے یا گنے یا اور جو بھی بیچوں گا یقیناً کچھ نہ کچھ بچا لوں گا۔ لیکن کیا اپنی رہائش کے شہر میں؟ اپنے دوستوں کے سامنے اور...... خصوصاً...... اُن لوگوں کے سامنے جو اتنے سمجھدار تھے کہ اُنھیں معلوم تھا کہ اجنبیوں کے مفادات کو اپنے افرادِ خانہ کے مفادات پر ترجیح نہیں دی جاتی؟ وہ تمام لوگ والد کی بااصول زندگی کو ایک طرح کی حماقت سمجھتے تھے۔ لیکن اُن پر ایک نظر تو ڈالیں! یہ فیصلہ کرنے کے بعد کہ ''تم صرف ایک بار جیتے ہو'' وہ اچھا لباس پہننا، اچھا کھانا کھانا، سفر کرنا اور عیش کرنا چاہتے تھے۔ اُنھیں اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ بہت سے لوگ ایسے نہیں جی سکتے تھے۔ وہ پہیوں کو ہمیشہ ویسے گھومتے دیکھنا چاہتے تھے جیسے دیکھتے آئے تھے۔ اُنھیں اِس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ پہیوں کے گھومنے میں کون سے عوامل کارفرما ہیں......

مجھے محسوس ہوا کہ میں تلووں میں سوراخ والے جوتوں اور گھسی ہوئی پتلون کے ساتھ شرمساری کے بھاری بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ ایک احمق باپ کے بیٹے نے احمق ہی ہونا تھا۔ وُہ دوسرے لوگوں کو اپنے ہی معیار (سے پرکھتے تھے۔ اُس معیار کے مطابق میں احمق، بدصورت اور قابل رحم تھا۔ چناں چہ مجھے اُن سے بچنا تھا، ان سے چھپنے کے لیے، تلووں میں سوراخ والے جوتوں اور گھسی ہوئی پتلون کے ساتھ اُن کی نظر سے دور رہنا تھا۔ اُن کے پاس گزرتے ہوئے اُن کی نفرت سے بھری نظریں اور مکارانہ سرگوشیاں مجھے بے چین کر دیتیں۔

میری شخصیت کا یہ پہلو تیزی کے ساتھ سامنے آنے لگا۔ مجھے اپنی مڑی ہوئی ناک، سوکھے ہوئے ہاتھوں اور پتلے چہرے سے شرمندگی ہونے لگی۔ جب بھی میں لوگوں کو اپنی طرف گھورتے ہوئے دیکھتا تو میرے بال کھڑے ہو جاتے اور میرے اندر ایک سرد اور غیر تسلی بخش احساس رینگنے لگتا۔ میرے کان بجنے لگتے، نظر دھندلا جاتی، میرے ہاتھ ٹھنڈے اور چپچپے ہو جاتے،

مجھے محسوس ہوتا کہ میں سکڑ رہا ہوں، میری مڑی ہوئی ناک اور بھی نیچے کو مڑ رہی ہے اور محسوس ہوتا کہ میں مزید بدصورت جن بن رہا ہوں۔

کچھ عرصے کے بعد مجھے دکانوں کے سامنے کی سجاوٹوں کے پاس سے بھی گزرتے ہوئے بے چینی کا احساس ہوتا۔ ایسے لگتا کہ بکنے کے لیے رکھی ہوئی چمکدار چیزیں خاص طور پر اُن لوگوں کے لیے ہیں جو خوش لباس ہیں، خوش خوراک ہیں اور تفریح کے لیے سفر کرتے ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا کہ اگر میں زیادہ نزدیک گیا تو نمائش کے لیے رکھی ہوئی اشیا ناپسندیدگی سے میری طرف دیکھیں گی۔ چناں چہ میں اُن سے بچنے لگا اور نمائش پر رکھی ہوئی نئی اور چمک دار چیزوں سے دور رہنے لگا۔

جب میں بچہ تھا تو سب کچھ کتنا پرسکون تھا۔ کیا بڑے ہو جانے کی وجہ سے یہ سب کچھ تھا؟ ایسے لگ رہا تھا کہ میرے اردگرد صرف اندھیرا تھا۔ مجھے غار کے دوسری طرف روشنی دیکھنے کی خواہش تھی۔ میں محسوس کرنا چاہتا تھا کہ باہر نکلنے کا راستہ بھی ہے۔ مجھے ایک مکمل تبدیلی کی خواہش تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مجھے نفرت سے دیکھے، خواہ میں خربوزے بیچ رہا ہوں، کارخانے میں کام کر رہا ہوں، تلووں میں سوراخ والے جوتے اور گھسی ہوئی پتلون پہنے ہوئے ہوں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ناپسندیدگی سے دیکھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ لوگ ناک اور ہاتھوں کی وجہ سے مجھے قہرآلود نظروں سے دیکھیں۔

لیکن اس کی اُمید نہیں تھی!

وقت گزرنے کے ساتھ نفرت بھری نظروں اور منافقانہ فقروں نے مجھے ایک قابلِ رحم گھونگھے کی طرح اپنے خول کے اندر سمٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ چناں چہ میں نے شہر سے باہر وقت گزارنا اپنا معمول بنا لیا اور کھلے کھیتوں میں وقت گزارنے لگا۔

کھیت! کھلی فضا!

تاہم میں محسوس کرتا تھا کہ میں نیلے آسمان کی خوب صورتی کی تعریف کرنے کے اہل نہیں، آسمان جو ایک بڑے گنبد کی طرح گھٹنوں تک اونچی سبز فصلوں پر جھکا ہوا تھا اور اُس نے وہاں ایسی جگہ بنائی ہوئی تھی جہاں شہد کی مکھیاں بھنبھناتی تھیں، تتلیاں پھڑپھڑاتی تھیں اور روشن دھوپ میں چڑیاں اور فاختائیں ایک دوسرے کا پیچھا کرتی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ مجھے گھونگھے کی طرح اپنے خول میں نہیں سمٹنا لیکن مجھے لگا کہ مقدر میرے خلاف کوئی سازش کر رہا ہے۔

میں اکثر گھاس پر لیٹ کر گزرتے ہوئے سرمئی بادلوں کو دیکھتا اور خدا کے پراسرار طریقوں کے بارے میں سوچتا۔

یہ خدا ہی تھا جو اندھیری رات میں، سیاہ زمین پر چلتے ہوئے، کالے رنگ کی بہت چھوٹی چیونٹی کے بہت چھوٹے قدم دیکھ سکتا تھا اور اُس نے وقت کے شروع ہوتے ہی یہ طے کر لیا تھا۔ وہ ہمارے مقدر کا حاکم تھا، کائنات کا مالک تھا اور برائی، اچھائی اور شیطان کا خالق تھا۔ وہ ہمارے خاندان سے کیا چاہتا تھا؟ والد سیاست میں کیوں گئے اور وہ ہار جانے والوں کا حصہ کیوں تھے؟ ہمارا انجام غربت کیوں تھا اور تلووں میں سوراخوں والے جوتے اور گھسی ہوئی پتلون پہن کر کیوں پھرنا پڑتا اور میں اپنے اردگرد سے نفرت کا نشانہ کیوں تھا؟

یہ خدا کی وجہ سے تھا۔ وہ جب سب سے چھوٹی چیونٹی کا سب سے چھوٹا قدم بھی دیکھ سکتا تھا، وہ جو ہمارے مقدر کا حاکم تھا اور کائنات کا مالک تھا، اُس نے وقت کے شروع ہوتے ہی متعین کر لیا تھا کہ یہ ہمارا قصور ہوگا۔ نفرت سے بھری نظریں کیوں؟ مجھے اپنے مقدر پر کوئی اختیار نہیں تھا اور اگر وہ مخالفوں کی طرف ہوا تو یہ بھیانک ہوگا۔

ایک دن اپنے اِن سوالوں کے جواب ڈھونڈتے ہوئے میں نے اُس کے نیلے آسمانوں کی طرف سر اٹھایا:

''تم مجھے کیا بتانے کی کوشش کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔ ''بتاؤ، ایسا کیوں کر رہے ہو؟ کیوں؟ اِس میں انصاف کہاں ہے؟ یہ قطعاً ٹھیک نہیں لگتا۔ تم ہم سے چاہتے کیا ہو؟ تم ہم پر ہنس رہے ہو۔ ہنس رہے ہو کہ نہیں؟ دوسروں کی طرح تم بھی ہم پر ہنس رہے ہو!''

مجھے یہ کبھی معلوم نہیں ہو سکتا کہ خدا نے میری بات سنی کہ نہیں یا وہ مجھ پر ہنسا کہ نہیں۔

لیکن میں دیکھ سکتا تھا کہ میں بچھو کی طرح ہوں جس کے اردگرد آگ کا دائرہ ہو۔ اگر میں شہر کی پکی سڑکوں پر چلتا تو میں اُن لوگوں کے تخلیق کیے ہوئے آگ کے دائرے کے بیچ میں ہوتا جن کا خیال تھا کہ وہ دنیا میں بسیارخوری اور دور دراز تک سفر کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اگر میں اپنے آپ کو کھلے کھیتوں کے حوالے کر دیتا تو میں خدا کے بنائے ہوئے آگ کے دائرے میں ہوتا۔ میرے پاس بھاگنے کے لیے کوئی تیسری جگہ نہیں تھی۔

پھر میں نے چیونٹیوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ میں اس چھوٹی سی مخلوق کے اُس سخت کام کی تعریف کرتا جس کی وہ اہل تھیں۔ اُن کی وہ اجتماعی طاقت مجھے تحریک دیتی جس کے ذریعے وہ بڑی تعداد میں اکٹھے ہو کر ایک مرے ہوئے کینچوے کو کھینچ رہی تھیں۔

اگر میں ایک چیونٹی ہو سکتا...... بحر حال، اُس کا ارادہ کیا تھا؟ مجھے انسان کیوں بنایا اور اُنھیں چیونٹیاں، دوسروں کو مکھیاں، گھوڑے، ہاتھی، شیر اور مچھلی بنایا......!

گھنٹے گزر جاتے۔ بادلوں میں گلابی عکس آ جاتا اور پسینے میں ڈوبے ہوئے مزدور انگور کے کھیتوں سے واپس آ جاتے۔ قطع نظر کہ میں ان چیزوں کے بارے میں جتنا بھی سوچتا، کوئی فرق نہ پڑتا۔ مجھے تخلیق کی پہیلیاں سلجھانے کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ جیسے ہی لگتا کہ میں جواب تک پہنچنے والا ہوں تو ایک نیا مسئلہ سامنے کھڑا ہوتا اور اب اندھیرے آسمان کے نیچے میں اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا اور میں لاچاری کی حالت میں، بازو لٹکائے، شہر کی طرف اور آگ کے اُس دائرے کی طرف چل پڑتا۔

میں کبھی کبھار سکول بھی چلا جاتا۔ ایک دِن ہیڈ ماسٹر نے مجھے، کردسرمد اور ممتاز ریچھ کو ہماری غیر حاضریوں کے متعلق بتانے کے لیے اپنے دفتر میں بلایا۔ اُس نے ہمیں ایک قطار میں کھڑے کر لیا لیکن سب سے زیادہ وہ مجھے گھور رہا تھا۔

''جہاں تک تمہارا تعلق ہے؟'' اُس نے بات ختم کی ''خاص کر تم، ایک سو اور چھتیس نمبر، تم سب سے زیادہ نالائق ہو۔''

میں نے اپنی آنکھیں جھکائی ہوئی تھیں اور مجھے چکر آ رہے تھے۔ میرے کان بج رہے تھے۔ میں، ایک سو اور چھتیس نمبر، خاص کر میں۔ گھونسلے سے گرایا گیا بوٹ، اتنا کڑوا پھل جسے پالا بھی خراب نہیں کر سکتا۔ میں ابھی تک آگ کے دائرے میں کیوں ہوں؟ مجھے اُن سے توقع کیا تھی؟ اُن کا ''آسان کمائی'' والا سٹیفکیٹ؟ اِن لوگوں کے بیچ میں ایک چھوٹا سا گھونگھا ہوں، جسے سکڑ کر اپنے خول میں سمٹ جانا ہے اور پھر وہیں رہنا ہے۔ درست؟

اُن کے ڈیلوے اُن کے ہی حوالے، میں نے سوچا، میں جا کر اپنا ہی کچھ کروں گا۔

چناں چہ میں نے سکول کو خیر آباد کہہ دیا۔

(XII)

جب میں نے سکول چھوڑنے کا اعلان کیا تو والدہ دیر تک روتی رہیں۔

''میرے خدایا!'' اُنھوں نے بین کیا ''مجھے یہی ڈر تھا۔ کیا میرے بیٹوں نے چھوٹے انسان ہی بننا تھا؟ ہمیشہ کے لیے وُہ دوسروں کے آگے جھکتے رہیں گے؟ جب اُن تمام اُمیدوں کا خیال آتا ہے، جو تھیں!''

میرے اندر برہمی نے سر اُٹھایا۔

''میں کبھی کسی کے آگے نہیں جھکوں گا،' میں نے اعلان کیا 'کسی بھی قیمت پر۔''

مجھے اپنے اوپر سے ایک بوجھ اُٹھتے ہوئے محسوس ہوا، گویا میں نے آگ کے دائرے میں، آخر کار، ایک شگاف ڈھونڈ لیا ہے۔ مجھے لگا کہ والد اور نیازی مجھے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

''بہت خوب، بیٹا۔'' میرے قیاس میں والد کہہ رہے تھے ''جب کہ خاندان فاقوں سے مر رہا ہے تم نے ہوائی قلعے تعمیر کرنا بند کر دیا ہے۔''

''تم نے سکول تو چھوڑ دیا ہے لیکن تمھیں ابھی تک کوئی کام نہیں ملا۔'' والدہ نے چند دنوں کے بعد کہا۔ ''مناسب ہو گا کہ تم دوڑ دھوپ شروع کرو اور زمینوں کا مسئلہ حل کرو۔''

اُن کی بات درست تھی۔ والدہ بالکل صحیح کہہ رہی تھیں، لیکن وُہ کھیت...... بارش، گھٹنوں گھٹنوں کیچڑ، گرمیوں میں دھپھٹر، گاؤں کے گندے پیہے، خشم گیں کتے، سرخ چہرے اور

خاکستری نیلی آنکھوں والا عبدالفتح جو دادی کو "میری اچھی خاتون" کہتا ہے۔

اگر اُس نے مجھے بھی بھگا دیا؟

"تم ایک مرد ہو!" والدہ نے کہا "تمھارے ساتھ ایسا کچھ کرنے سے پہلے اُنھیں سوچنا پڑے گا۔ دیکھو! میں تو ایک عورت ہوں۔"

ایک صبح، طلوعِ آفتاب کی گلابی دھند میں، میں منی بس سٹاپ پر لگی قطار میں شامل ہو گیا اور ہم میں سے تقریباً بیس لوگ چرچراتی بس پر سوار ہو گئے۔ ہم کوؤں سے بھرے اُس قصبے کی طرف چل پڑے جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ میں اُس پرانے فارم پر برسوں کے بعد جا رہا تھا۔ میں سوچتا رہا کہ وہاں میری کس کے ساتھ ملاقات ہو گی؟ کیا میڈم سیلیم کے ساتھ ملاقات ہو گی جو سردیوں کی لمبی راتوں میں ہمارے کام آتیں، ہمیں ننگا کر کے بستروں میں لٹاتیں اور بادشاہ اور پریوں کی، جنوں کی، زمرد جیسی آنکھوں والے فونیکس کی، سانپوں کی، کن کھجوروں کی اور عقل مند بوڑھے عامل کی کہانیاں سنایا کرتی تھیں یا دیہاڑی دار کا غلیظ بیٹا جس نے ہمیں کچے بینگن کھانے سکھائے یا اُن چوزوں کے ساتھ جنھیں نیازی اور میں تربیت دینے کے لیے شاخوں کے ساتھ اُلٹا لٹکایا کرتے تھے؟

منی بس میں پیروں، لہسن اور پنیر کی بو آ رہی تھی۔ میں عبدالفتح کی بے رحم آنکھوں کو اپنی طرف گھورتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ منی بس مسافروں کے بوجھ تلے چرچراتے ہوئے، جھنجھناتے ہوئے، موڑ کاٹتے ہوئے، کسی نہ کسی طرح سڑک پر چلے جا رہی تھی۔ بس کے ریڈی ایٹر کا ڈھکن نہیں تھا اور اُس کی جگہ لکڑی کا گٹکا پھنسایا ہوا تھا جس کے اردگرد چھوٹے سوراخوں میں سے بھاپ غصے کے ساتھ خارج ہو رہی تھی۔

میری نظر سنگِ کلومیٹر پر جمی ہوئی تھی۔ مجھے والد کے ساتھ اِس راستے پر سفر کرنے کا کئی مرتبہ اتفاق ہوا تھا۔ والد گاڑی چلا رہے ہوتے تھے اور میں اُن کے ساتھ بیٹھا ہوتا۔ گاہے بہ گاہے وہ پہیہ مجھے تھما دیتے تاکہ سگریٹ سلگا سکیں۔ جب وہ سگریٹ سلگا رہے ہوتے تو میں جلدی سے رفتار والے لیور کو آگے کر کے رفتار بڑھا دیتا۔ کار ناقابلِ یقین رفتار کے ساتھ یک لخت آگے کودتی۔ پریشانی کے عالم میں والد ایک دم ایکسیلیٹر لیور کو پیچھے کھینچتے۔

"احمق!" وہ چیختے "تم کار اُلٹا دو گے۔"

سڑکیں ابھی تک ویسی ہی تھیں اور سنگِ کلومیٹر بھی اُسی طرح تھے۔ دور فاصلے پر بوڑھے پہاڑ اُسی طرح کھڑے تھے جو لہروں اور چوٹیوں کی شکل میں اونچے ہوتے جا رہے تھے۔ آخر کار پرانا قصبہ فاصلے پر نمودار ہوا، پہلے وہ ایک لکیر کی طرح لگا۔ ہم قصبے کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ قصبے میں داخل ہوئے تو سورج کی گرمی میں پکی ہوئی دیواریں تنگ سڑک کے ساتھ چل رہی تھیں اور ہم اُن کے ساتھ تقریباً رگڑ کھا رہے تھے۔ منی بس ناہموار سڑک پر لڑھکتی جا رہی تھی اور جب ٹیکسی سٹینڈ پر پہنچے تو بس جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ میرے پاؤں سو گئے تھے۔ میں بازار کی طرف چل پڑا۔ میرے ہاتھ جیبوں میں تھے اور وہ وہاں پڑے چند سکوں کو چھو رہے تھے۔ کسی نے بھی میرے تلووں میں سوراخوں والے بوٹوں، گھسی ہوئی پتلون، مڑی ہوئی ناک، ہڈیوں والے ہاتھوں اور اور پتلے چہرے کی طرف توجہ نہ دی۔ کسی نے میری طرف ایک نظر بھی نہ ڈالی۔ یہ صحیح معنوں میں آزادی تھی۔ مجھے اِس قصبے کے لوگ اچھے لگے، وہ لوگ جنھوں نے مجھے نظر انداز کر دیا تھا۔

میں اپنے بائیں ہاتھ پر واقع البانوی اوپن ایئر کیفے کے سامنے سے گزرا۔ مجھے کیفے کے سامنے کھڑی کی ہوئی اپنے والد کی سرخ رنگ کی فورڈ کار یاد ہے اور وہ نوجوان عرب بھی یاد ہے جو کار کی نگرانی کر رہا ہوتا اور ہاتھ میں سپینر پکڑے کسی نہ کسی پرزے کو کس رہا ہوتا یا سپارک پلگ صاف کر رہا ہوتا اور والد وہاں بیٹھے رہتے یا اپنے ڈاڑھی والے ریٹائرڈ جنرل دوست کے ساتھ گندم، جو یا کپاس کی قیمتوں پر تبادلۂ خیال کرتے ہوئے پنسل کے ساتھ اپنے سگریٹوں کی ڈبیہ پر حساب کتاب کر رہے ہوتے۔ وہ گاہے بہ گاہے ایک دوسرے کو دیکھتے، مسکراتے اور آنکھ مارتے۔ سرخ ڈاڑھی والا جنرل ایک سخت مزاج آدمی تھا۔ وسیع ایکڑوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے وہ اپنے بازوؤں کو کھول کر بات کرتا۔

وہ ہماری جنگِ آزادی کے ناقابلِ یقین واقعات سناتے ہوئے ساری توجہ کو اسیر کیے رکھتے۔

بعض اوقات والد اور وہ ایسی باتیں کرتے جن میں مجھے کوئی دلچسپی نہ ہوتی۔ میں

انگڑائیاں یا جمائیاں لیتا رہتا یا دروازے کے اندر لگی عالی نسب گھڑ سوار کی تصویر کو دیکھتے ہوئے اُس میں گم ہو جاتا اور یا کیفے کے باہر لکڑی کے چوکھٹے کو اُٹھائے ستونوں کو از سرِ نو گنتا۔

سڑک پر چلتے ہوئے مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ میں کیفے کے پاس سے گزرا، پھر بقال، حجام اور دیگر کیفوں کے سامنے سے گزرا۔ مجھے لگا کہ میں فوارے کے پاس کھڑے قلم اور کاغذ فروش کو جانتا ہوں۔ میں تو اُسے پہچانتا تھا لیکن اُس کے مجھے پہچاننے کے امکانات بہت کم تھے۔ وُہ چپٹے سر والا اتر کمنستان کا رہنے والا تھا۔ جب ہم بازار کے نزدیک والی مسجد میں تعلیم حاصل کر رہے تھے تو ہم کتابیں قلم اور کاغذ لینے کے لیے اکثر اُس کی سیلی اور افسردہ سی دکان پر جاتے۔ وہ ''اناطولین چائیلڈ پرایئر'' کا مقامی سٹاکسٹ بھی تھا۔

اُن دنوں میں اُنھوں نے ہمیں فوجی مارچ کا ایک گانا سکھایا تھا جسے جنرل کاظم کارابیکر نے لکھا اور دھن تیار کی تھی۔ وُہ ہمیں طویل مارچ پر لے جاتے اور ہم سے گانا گواتے:۔

لوہے کے بازو
تانبے کے پاؤں
کیا ترک سر جھکائیں گے؟
کیا ترک سر جھکائیں گے؟
ترک سر کبھی نہیں جھکاتے
ترک سر کبھی نہیں جھکاتے
ترک سر کبھی نہیں جھکاتے

میں سڑکوں پر سست قدموں کے ساتھ چل رہا تھا۔ مجھ پر کوئی کھچاؤ نہیں تھا...... مارچ کے وہ حصے جو مجھے یاد تھے، میں آہستہ آہستہ گنگنا رہا تھا:۔

یونانیوں کی فوج
کیڑے رینگتے ہوئے
کیا ترک سر جھکائیں گے؟
کیا ترک سر جھکائیں گے؟

ترک سر کبھی نہیں جھکاتے
ترک سر کبھی نہیں جھکاتے
جو بھی ہونا ہے وُہ ہو
ترک سر کبھی نہیں جھکاتے

ہمارا ایک چھوٹے قد کا، کالی رنگت والا، گول مٹول اُستاد تھا جو ہمارے دستے کی قیادت میں تال کے مطابق چلتا اور جس کا جسم سور کی طرح پسینے میں نہایا ہوتا۔ پسینے کے ساتھ اُس کی ترکی ٹوپی سے سرخ رنگ اُس کے ماتھے اور گالوں پر بہہ کر اُسے مسخرہ بنا دیتا۔ ہم ہنستے ہنستے دوہرے ہو جاتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ......

اچانک میرا نام پکارا گیا۔ اوخدایا...... کیا کوئی میرے جاننے والا ہے؟ میں دیکھنے کے لیے مڑا۔ میرا جاننے والا ہی ہے۔ لیکن کیسے! وہ آدمی نہ صرف مجھے جانتا تھا بلکہ میرے دادا کو بھی جانتا تھا۔ یہ وُہ آدمی تھا جو برسوں پہلے ہمارے فارم پر آیا تھا اور جس نے شہروں میں افراتفری کی بات کی تھی اور گندم کے ایک سٹے کے دانے گنے تھے۔ وُہ ہائی کورٹ کا سابقہ رکن تھا۔

پتا چلا کہ اب اُس کی ہارڈ ویئر کی دکان تھی۔ اُس نے مجھے اپنے سٹور پر آنے کی دعوت دی۔ اُس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور دونوں کے لیے کوفی منگوائی۔ اُس نے تفصیل کے ساتھ میرا معائنہ کیا۔ ایک دوستانہ اور محبت بھرے انداز سے میرا معائنہ کیا جا رہا تھا لیکن چوں کہ کئی سالوں سے مجھے اِس انداز سے دیکھا نہیں گیا تھا، میں بے چین سا ہو گیا۔ مجھے اپنا چہرہ اور ہاتھ دوبارہ گیلے ہوتے محسوس ہوئے اور مجھے یقین تھا کہ میری ناک اور بھی نیچے ہو گئی ہو گی۔ اگر اُس کی نظر میری گھسی ہوئی پتلون پر پڑ گئی؟

میں اُس سے نظر بچاتا رہا۔ میرے لیے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ مجھے دوستانہ نظر سے گھورا جا رہا ہے، کبھی کبھار غیر محسوس طریقے سے اپنا سر باہر نکالتے ہوئے، میں اپنے خول کے اندر سمٹ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ وُہ شاید کہہ دے: کتنا دبلا اور بدصورت نوجوان ہے! اِس کا باپ تو اتنا خوش شکل تھا......

دراصل وہ خوش مزاجی سے میرے ساتھ باتیں کیے جا رہا تھا۔ اُس نے والد کے بچپن، تپ دق سے فوت ہونے والے میرے چچا، میری پھوپھیوں، پرانے وقتوں کی مٹھائیوں اور رمضان کے بعد منائے جانے والے جشن کی باتیں کیں۔ میں نے آہستہ آہستہ اپنے سر کو خول میں سے باہر نکلنے دیا۔ میں بھی آدمی کی طرف گرم جوشی کا مظاہرہ کرنے لگا، ہمارے درمیان میں دیوار نیچی ہو رہی تھی۔ میں آرام سے ہونا شروع ہو گیا۔

''تم قطعاً اپنے والد جیسے نہیں ہو۔'' اُس نے ایک دم اعلان کیا ''وہ عظیم آدمی گھر کے معمول کے دروازے میں سے نہیں گزر سکتا تھا۔ تم بہت دبلے ہو۔''

میں فوراً اپنے خول کے اندر چلا گیا اور ہمارے درمیان میں دیوار پھر بلند ہو گئی۔

اُس کا اگلا سوال دوسرے جھٹکے کی طرح تھا۔

''میرے مطابق تم نے ہائی سکول ختم کر لیا ہو گا؟''

مجھے نالائقی کے احساس نے اپنے نیچے دبا دیا۔ میں یقیناً دنیا کا بدصورت ترین اور دبلا ترین شخص تھا۔ اگر اُسے پتا چل گیا کہ میں نے ہائی سکول تک تعلیم مکمل نہیں کی، میں نے تو ابھی آدھی منزل تک طے نہیں کی اور مڈل سول تک تعلیم لی ہے، تو کیا ہو گا؟

مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دوں؟

''چلو میرے گھر چلیں۔'' اُس نے بات جاری رکھی۔ ''میں چاہتا ہوں کہ میری بیوی تمھیں دیکھے۔ اُسے تمھیں دیکھ کر حیرت ہو گی کہ تم کتنے بڑے ہو گئے ہو!''

ایک تباہی کے بعد دوسری! اُس نے مجھے بہانہ بنانے کی بھی مہلت نہ دی۔ اُس نے اپنی چلنے والی چھڑی اور فلیٹ ہیٹ اُٹھایا اور ہم سٹور سے باہر نکل گئے۔

''تم کھل نہیں رہے ہو میرے بچے!'' اُس نے کہا ''میں نہ صرف تمھارے باپ کو جانتا تھا بلکہ تمھارے دادا کو بھی جانتا تھا۔ تمھارے بے چینی میں مبتلا ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ تمھارے والد، وہ ایسے آدمی تھے......''

میں اُس کے پیچھے اور تھوڑا بائیں چل رہا تھا۔ میں اپنے جوانی کے قدموں کو اُس کی بڑھاپے والی چال کے مطابق رکھنے کی کوشش میں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ایک اُلجھن میں

مبتلا ہوں اور والدہ کا عکس میرے سامنے گھوم رہا ہے۔

''اپنی حالت تو دیکھو۔'' وہ مجھے کہہ رہی تھی، ''تم ایسی ہستی میں تبدیل ہو گئے ہو جو دوسروں کے آگے سر جھکاتا ہے۔''

میں نے اپنے آپ کو جھنجھوڑا۔ میں نے اپنے کوٹ کے بٹن کھولے اور اپنے قدم ذرا لمبے کیے۔ میں اُس کے برابر آیا۔ والدہ وہاں سے غائب ہو گئیں۔ جیسے ہی میں نے اُس بوجھ سے چھٹکارا حاصل کیا تو مجھے احساس ہوا کہ مجھے اُس کے ساتھ چلنے کا کوئی حق نہیں۔ آخر کار وہ ہائی کورٹ کا رکن تھا اور میں تو مڈل سکول بھی پاس نہیں تھا!

میں تھوڑا پیچھے ہو گیا اور میں نے کوٹ کے بٹن بند کر دیے۔ والدہ واپس آ گئیں......

ہم اُس کے گھر پہنچ گئے۔ یہ پتھروں سے تعمیر کیا ہوا ایک دو منزلہ مضبوط گھر تھا۔ اُس نے نہایت چابک دستی کے ساتھ دروازے کے کنڈے کو دو مرتبہ اوپر نیچے کیا۔ دروازے کے پیچھے مجھے گھسٹتے ہوئے جوتوں کی آواز آئی۔ دروازہ کھلا۔ ایک بزرگ خاتون، جو اپنے سر پر سفید رومال پہنے ہوئے تھیں، باہر جھانک کر واپس اندر چلی گئیں۔ ہم گھر میں داخل ہو گئے اور وہ عورت مزید اندر چلی گئی۔ آدمی اپنے آپ سے بڑبڑائے جا رہا تھا۔

''تم اِس نوجوان کو پہچان سکتی ہو، پیاری!'' وہ کہتا ہے۔

عورت، جسے اسلام نے ڈھالا ہوا تھا، اجنبی کی طرف دیکھتے ہوئے پریشانی کا شکار تھی۔

''میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتی۔ کسی حد تک مانوس تو لگتا ہے......لیکن......''

ساتھ والے کمرے میں سے ایک چڑچڑے بچے اور اُسے دلاسہ دیتی نوجوان عورت کی آواز آئی۔

''ذرا سوچو، تم جانتی ہو کہ یہ کون ہے!''

اور میں، ایک بے صبرے بوڑھے اور گھبرائی ہوئی عورت کے، جو مجھے گھور رہی تھی، سامنے کھڑا تھا۔ اچانک لوری کی آواز آنا بند ہو گئی۔

''شازیے، بیٹی!'' آدمی نے آواز دی ''بچے کو چھوڑ کر ایک منٹ کے لیے آؤ!''

میں پھر اپنے خول میں سکڑ گیا۔ میرے علم میں تھا کہ ہمارے ساتھ شامل ہونے والی جوان عورت میری بدصورتی دیکھ کر سکتے میں آ جائے گی۔ مجھے شرمندگی، شرمندگی، شرمندگی کا احساس ہونے لگا۔ میری پتلون گھسی ہوئی تھی، میرے جوتوں میں سوراخ......

''جی، والد؟''

کالی سیاہ آنکھوں کی جوڑی، سفید چہرہ اور الجھے ہوئے بال۔

میرا دِل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے اپنے چہرے پر خون کا دباؤ محسوس ہوا۔ اُس کے سفید پلو نے سر کے اوپر سے کھسک کر کندھوں پر آ کے کافی کچھ دکھا دیا۔ میری نظر اُس کی کسی ہوئی چھاتیوں اور بھرے ہوئے سینے پر گئی...... مجھے اُس عورت کو اپنے لیے کسی قسم کی کشش محسوس کرنے کا امکان نظر نہیں آیا۔

''تمہاری ماں نے اسے نہیں پہچانا۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم پہچان سکتی ہو یا نہیں!''

جوان ماں میری عمر کی ہی ہو گی۔ اُسے کسی قسم کی جھجک نہیں تھی۔ اُس نے میرے چہرے کا غور سے جائزہ لیا۔ میرے ناک کا خم کھلے زخم کی طرح درد کر رہا تھا۔ میں نے فرض کیا کہ وُہ سوچتی رہی ہے ''کتنا بدصورت شخص ہے!''

''ایمان داری کی بات ہے ابا کہ میں وثوق کے ساتھ......''

''ہا۔ ہا۔'' بوڑھے آدمی نے کہا۔ ''میں نے اُسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔'' اُس نے وضاحت کی۔

بوڑھی خاتون نے، جو اجنبی کی موجودگی کی وجہ سے پریشان تھی اور جوان ماں کے ساتھ کھڑی تھیں، واضح سے اطمینان کے ساتھ سر کے رومال کو کھول دیا۔

''میری حالت پر غور کریں۔'' اُس نے کہا ''ذرا سوچیں تو...... اوہ...... تم اتنے بڑے ہو گئے ہو، ہے نا؟''

پھر وُہ اپنے خاوند کی طرف مڑی۔

''یہ اپنے والد کی طرح بالکل بھی نہیں، کیوں نا؟''

''بالکل نہیں۔ اس کے والد دروازے میں سے نہیں گزر سکتے!''

مجھے محسوس ہوا کہ میں خلا میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے نیچے گرتا ہی چلا جا رہا ہوں۔

میرا دبلا پن، میری ٹیڑھی ناک، میرے سوکھے ہوئے ہاتھ، میری تعلیم کی کمی، میرا یہ، میرا وُہ، میرا کچھ اور......

انھوں نے والد، والدہ، پھوپھیوں کے متعلق کئی سوالات پوچھے۔ شازیے باورچی خانہ میں خشک گوشت کے ساتھ انڈے بنانے گئی ہوئی تھی اور ہم اُن کے کھانے والے کمرے میں گیس کے لیمپ کی روشنی میں میز پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مجھ سے جتنے سوالات پوچھے جا رہے تھے میں اُتنی باتیں نہیں کر رہا تھا۔

کھانا آ گیا اور ہم کھانے لگے۔ میں تمام احمقانہ طریقوں سے حرکت کرتا رہا تا کہ شازیے میرے سوکھے ہاتھ نہ دیکھے۔ اپنی عجلت میں، مَیں منہ میں سے چیزیں گرا دیتا اور نوالوں کو منہ میں ڈالنا بھول جاتا۔ میری کتنی خواہش تھی کہ میں دنیا کا خوب صورت ترین آدمی ہوتا۔

''ہماری شازیے''، بوڑھے نے بتایا ''چھوٹی عمر میں ایک بچے کے ساتھ بیوہ ہو گئی ہے۔''

فلاں کے بیٹے نے زمین کے تنازعہ پر بوڑھے کے داماد کو پچھلے سال گولی مار دی تھی۔

اُس کے بیوہ ہونے سے میری کچھ ڈھارس بندھی۔ اِس سے انکار نہیں تھا کہ میرے اندر متعدد خامیاں تھیں۔ دوسری طرف وُہ بیوہ تھی۔ اگر اُس نے مجھے پسند کر لیا اور ہماری شادی ہو گئی...... میں بچے کو کبھی نہیں ماروں گا۔ لیکن شادی کیسے ہو سکتی ہے؟ اور میں بے کار، بدصورت، جوتوں میں سوراخ والا، گھسی ہوئی پتلون والا، غیر تعلیم یافتہ تھا...... یہ نہیں ہو سکتا۔

ان گنت بار میری نظر اپنے سوکھے ہوئے ہاتھوں پر گئی۔ میں نے اُنھیں میز سے ہٹا کر اپنی گود پر چھپا لیا۔

''کیا بات ہے میرے بچے؟'' بوڑھے نے پوچھا ''تمھیں کھانا چاہیے۔ اپنی طرف دیکھو...... تم صرف کھال اور ہڈیاں ہو۔''

میں اکڑ کر بیٹھ گیا۔ مجھے لگا کہ میرے جسم کے سب سے حساس مقام پر چھری کے ساتھ مارا گیا ہے اور کہا بھی شازیے کے سامنے، وہ یہ کیسے کر سکتا تھا؟ میں اُس وقت اُن کے گھر

سے بھاگ کر جا سکتا تھا، مجھے صرف اخلاقی پابندی روکے ہوئے تھی۔ میرے ماتھے سے ایک ٹھنڈک نکل رہی تھی۔

پھر بوڑھی عورت نے اپنے خاوند سے ایک سوال پوچھا۔

''نہیں۔'' آدمی نے کہا ''اُس نے ابھی ہائی سکول کی تعلیم مکمل نہیں کی۔''

یہ لوگ آسانی کے ساتھ کمائی ہوئی دولت کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔

''مڈل سکول؟'' عورت نے پوچھا۔

''مڈل سکول کی تعلیم تو یقیناً اُس نے مکمل کر لی ہوگی۔''

وہ میری طرف دیکھنے کے لیے مڑے۔ مجھے گفتگو کے اِس رخ کو کسی طرح ختم کرنا تھا۔

جناب، کیا آپ نے Two Friends Travel the World پڑھی ہے؟''

بوڑھے کو اچانک حیرت ہوئی۔

''مجھے صحیح طرح سے یاد نہیں۔'' اُس نے کہا ''مجھے یہ بتاؤ، نوجوان کہ تم کچھ کام کرتے ہو؟ کہیں پر کوئی ملازمت ہے؟ ممکن ہے ہم تمھارے لیے یہاں کچھ بندوبست کرسکیں۔ تم اِس طرح اِدھر اُدھر پھرتے ہوئے زندگی نہیں گزار سکتے۔ اگلی مرتبہ جب آؤ تو اپنے ساتھ مڈل سکول کا ڈپلومہ لیتے آنا اور مقامی حکام کے ساتھ تمھارے لیے کام کا کوئی بندوبست کرنے کی کوشش کریں گے۔''

میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

''آپ نے نوکری کا کہا ہے؟'' میں نے اپنا سر اُٹھاتے ہوئے اعتماد کے ساتھ کہا ''شکریہ۔ لیکن نہیں۔ میں نے بینک کلرک کا امتحان دیا ہے۔ چند دنوں میں ملازمت شروع ہو جائے گی۔''

آدمی کو حیرت ہوئی۔

''اوہ؟ خوب، بہت خوب......''

''جی، واقعی۔''

''تم نے بینک کہا؟''

''جی، بینک میں۔''

''ہائی سکول پاس کرنے والے لوگ امتحان میں نہیں بیٹھے؟''

''امتحان میں ہم بیس لوگ بیٹھے تھے۔ پانچ ہائی سکول پاس تھے اور تین اکاؤنٹنٹ تھے۔''

''بہت خوب۔ میرا خیال تھا کہ......''

اُس نے سوچا تھا کہ یہ لاغر، بدصورت، شرمیلا، مڈل سکول پاس لڑکا انتہائی فضول ہے۔ اُسے کیا معلوم؟ میں نے دوڑ شروع کرنے والی بندوق چلا دی تھی۔ اب مجھے پوری قوت کے ساتھ بھاگنا تھا۔

''میں یہاں اپنے رقبے کا مسئلہ حل کرنے آیا تھا۔ ہماری زمین کافی ہے لیکن اُس میں سے کچھ پر غیر قانونی قبضہ کر لیا گیا ہے۔ میں یہاں اُسی مسئلے کو حل کرنے آیا ہوں۔ دراصل ہمیں اُس کی آمدنی کی اتنی ضرورت نہیں۔ زمین سے حاصل ہونے والی آمدنی کی وجہ سے مجھے کوئی کام کرنے کی ضرورت تو نہیں لیکن میں نے سوچا کہ مجھے کوئی ملازمت کر ہی لینی چاہیے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ بے کار رہنے سے...... یہاں عبدالفتح نامی ایک آدمی ہے۔ وہ میری دادی کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آیا تھا۔ میں اُس کے ساتھ معاملات طے کرنے آیا ہوں۔ اِس سفر کے لیے میں نے جان بوجھ کر پھٹے ہوئے بوٹ اور گھسی ہوئی پتلون پہنی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میرے پاس انتخاب کرنے کے لیے کافی جوتے اور لباس ہیں۔''

یہ سب میں نے کیسے گھڑ لیا! موجودہ حالات میں بینک کا امتحان کتنا اہم تھا۔

''میں پہلے بی اے کا امتحان دوں گا اور پھر یونیورسٹی میں داخلہ لوں گا۔ بعد میں شاید یورپین امتحانات میں بھی بیٹھوں۔''

بوڑھے نے بیوی کو آنکھ ماری۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ کتنا ذہین اور مشتاق نوجوان ہے۔''

''اپنے والد کی طرح، ہوں نہ؟'' عورت نے کہا۔

میں نے فخر کے ساتھ شازیے کی طرف دیکھا۔ مجھے لگا کہ وُہ مجھے پسند کر رہی ہے۔ میری دیدہ دلیری گستاخی کی سطح تک پہنچ گئی تھی۔

پھر ہم دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ کمرے کے پردے اور تخت کی چادر سفید رنگ کی تھی، اخروٹ کی لکڑی کا پنگورا تھا، دھلائی والے کپڑوں کا ڈبہ پیلے رنگ سے سجائے ہوئے ٹرنک میں رکھا تھا اور دیواروں کے ساتھ لباس لٹک رہے تھے۔ شازیے نے بچے کو چھاتی سے دودھ پلوانا شروع کر دیا۔ بیچ بیچ میں وہ اپنا سر اُٹھا کر مجھے دیکھ کر مسکرا دیتی۔ میں پُراعتماد محسوس کر رہا تھا۔ میں اُس کی نظروں کا دلیری کے ساتھ جواب دینے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ میں اپنے اندر نکھی سی سرگوشی محسوس کر سکتا تھا۔ پھر اُس کے باپ نے کہا کہ وُہ کیفے میں جا رہا ہے اور چلا گیا۔ میں پھر آرام سے ہو گیا۔ میں نے اُسے ہر طرح کی باتیں سنانا شروع کر دیں۔

میں نے اپنی جیب میں سے فلمی رسالہ نکالا تو شازیے میرے نزدیک آ کر بیٹھ گئی۔ ہم اکٹھے ورق گردانی کرتے رہے۔ کبھی کبھار ہمارے سر مس ہو کر چنگاریوں کی وجہ بنتے۔ ہم نہانے والا لباس پہنے ایک اداکارہ کو دیکھتے رہے۔ شازیے کی ماں تخت پر تھی اور اُس نے خراٹے لینا شروع کر دیئے تھے۔ میں شازیے کے ذرا قریب ہو گیا اور پھر مزید قریب۔ میرے بازو کا حصہ اُس کی پھولی ہوئی چھاتی کو چھو رہا تھا۔ مجھے لگا کہ میرا بازو جل رہا ہے۔ میں کانپ رہا تھا اور میری آنکھوں میں شعلے تھے۔ میں نے رسالہ گرا دیا اور اُس کی کمر کے گرد بازو ڈال دیا۔

وُہ مچھلی کی طرح میری گرفت میں سے نکل گئی اور بچے کے پنگورے کے پاس کھڑی ہو گئی۔

''بے حیا آدمی!'' اُس نے غصے سے کہا۔

میری نازک سی خود اعتمادی پاش پاش ہو گئی۔ میں دوبارہ اپنے خول میں داخل ہو کر سکڑ گیا۔ ہمارے درمیان میں دیوار بلند ہو گئی۔ میری ٹیڑھی ناک، سوراخوں والے میرے بوٹ، میرے سوکھے ہوئے ہاتھ اور گھسی ہوئی پتلون، سب مجھے ڈرانے آ گئے اور والدہ بھی۔

''ارہ میرے پیارے، میرے پیارے!'' وہ بچے کو کہہ رہی تھی۔

شازیے میری طرف پیٹھ کیے کھڑی تھی اور مجھے دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ میں اب کیا

کروں؟ کیا میں چلا جاؤں؟ نہیں، مناسب نہیں ہوگا۔ اُس کا باپ پوچھے گا کہ میں کیوں چلا گیا اور وہ وجہ بتا دے گی۔ لیکن اگر میں ٹھہر جاؤں...... میں یہاں رہ کر کیا کروں گا؟

اگر وُہ اپنی ماں کو بتا دے؟ ''وہ لعنتی آدمی، اُس نے یہ کیا اور وُہ کیا'' شاید وُہ کہے۔ اور اگر اُس کی ماں نے اُس کے باپ کو بتایا۔ ''جانتے ہو کہ وُہ کم بخت لڑکا تمھاری بیٹی کے ساتھ کیا کر رہا تھا؟''

میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ میں متذبذب سا تھا۔ پھر اُس کی ماں آنکھیں ملتے ہوئے جاگ گئی۔ بیٹی نفرت کے ساتھ دیکھتے ہوئے میری طرف مڑی۔ میں نے خدا سے دعا مانگی کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ کوئی بات نہ کرے۔ بوڑھی عورت اور میں اوپر والی منزل پر چلے گئے۔ اُس نے تیزی کے ساتھ میرا بستر بچھایا اور شب بخیر کہہ کر چلی گئی۔

میرے لیے وُہ رات اچھی کیسے ہو سکتی تھی؟ میری خواب گاہ کی کھڑکی گلی میں کھلتی تھی۔ میں غیر حاضر دماغی کے ساتھ اُنگلی کو چوستے ہوئے اور کئی قسم کی باتیں سوچتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ آسمان پر سرد چاند چمک رہا تھا۔ گیلے گھروں کی قطاریں ایک دوسرے کے ساتھ چمٹی ہوئی تھیں۔ زرد لالٹینیں جمی ہوئی خاموشی کو روشن کر رہی تھیں۔

اگر اُس نے اپنی ماں کو بتا دیا تو؟ اور اگر ماں نے اُس کے باپ کو کہا ''تم اپنے نوجوان کی کرتوتیں جانتے ہو؟ اگر تم گلی سے آوارہ لوگوں کو اُٹھا کر گھر لانا چاہتے ہو......''

میں نے تصور کیا کہ بوڑھا اُداسی کے ساتھ سنے گا اور وقت کی تبدیلی پر اپنی رائے دے گا کہ بچے کیسے اپنے باپوں یا باپوں کے باپوں کی طرح نہیں رہے تھے۔

''لیکن۔'' میں اپنے آپ سے کہتا رہا۔ ''کیا لڑکی اپنی ماں کو کچھ بتائے گی؟''

شاید وہ بتا دے، شاید وہ نہ بتائے۔ میں نے جیب سے پانچ کروس کا سکہ نکالا، اگر وہ بتائے گی تو مجھے تصویر والا حصہ دینا اور اگر نہیں بتائے گی تو لکھائی والا۔

پیالہ بنے ہاتھوں میں، میں نے سکے کو ہلایا، ہوا میں پھینکا اور وُہ تصویر والے حصے پر گرا۔ سو وہ بتا دے گی۔ اُس حالت میں اُس نے ابھی تک بتا دیا ہوگا۔ اُس کی ماں غالباً اُس کے باپ کی واپسی کی منتظر تھی۔ لیکن مجھے اتنا پختہ یقین کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے سکہ دوبارہ پھینکا اور

تصویر والا حصہ!

اب مجھے یقین تھا۔ لڑکی نے ماں کو ضرور بتا دیا ہو گا اور ماں، باپ کو ضرور بتا دے گی۔

دو دفعہ متواتر تصویر والا حصہ۔

مجھے ایک دم خدا اور مقدر کا فرمان یاد آ گیا۔ اِس بارے میں خدا نے وقت کے آغاز سے ہی حکم جاری کر دیا تھا۔ یہ سب اُسی وجہ سے ہو رہا تھا۔ اُس نے میرے لیے ایک مقدر کا فرمان جاری کیا تھا اور دوسرے کا شازیے کے لیے۔ ظاہر ہے کہ ہم اپنے الگ الگ راستوں پر تھے۔

میں نے سوچا کہ مجھے مقدر اور خدا کے فرمان کے متعلق بھول جانا چاہیے۔ مجھے تمام خاندان کے لیے ذلت کا سبب بننا تھا۔ میں کیا کر سکتا تھا؟ میں چپکے سے سیڑھیوں سے نیچے جا سکتا تھا، اُن کے دروازے کے ساتھ لگ کر باتیں سن سکتا تھا۔ اگر شازیے، یا اُس کی ماں اچانک باہر آ گئی اور مجھے اِس حالت میں دیکھ لیا؟

لگاتار دو مرتبہ...... اُس نے ضرور بتا دیا ہو گا! اور ماں...... اُسے تو صرف بوڑھے کا انتظار ہے۔ وُہ یہ سن کر کہے گا۔ ''تمھیں شرم آنی چاہیے۔ میں نے تمھارے ساتھ انسانوں والا سلوک کیا اور تمھیں گھر میں آنے دیا...... اور تم اپنا رویہ دیکھو......''

میں ابھی تک کھڑکی کے پاس تھا۔ چمگادڑ اردگرد اُڑ رہے تھے اور چاندنی میں خاکستری چاندی کی رنگت والے لگ رہے تھے۔ میں نے دور اُلو بولتے ہوئے سنا اور فرض کر لیا کہ کچی اینٹوں والے گھروں کے لوگ گہری نیند سو گئے ہوں گے۔

کپڑے اتار کر میں بستر میں لیٹ گیا۔

میں کیسے سو سکتا تھا؟

دو مرتبہ...... اُس نے ضرور بتا دیا ہو گا۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟

رضائی کے ساتھ سر ڈھانپنے کے باوجود میری طبیعت بحال نہ ہوئی۔ جب میں آنکھ بند کرتا تو میری نظر دروں بینی شروع کر دیتی۔ میرا اندر اور میں مکالمہ شروع کر دیتے:

''اگر وہ بتا دے تو تم کیا کرو گے؟''

''تصویر والا حصہ اوپر تھا، چناں چہ وہ بتائے گی۔ دراصل اُس نے شاید بتا دیا ہو گا۔''

''تم ایسا خیال کرتے ہو؟''

''ابھی تک اُس نے بتا دیا ہو گا۔''

''تم کیسے جانتے ہو؟''

''دو دفعہ تصویر والا حصہ اوپر آیا......''

''تم ہمیشہ ایسا کام کرتے ہو جس سے معاملات اُلجھ جائیں!''

''تم نے عورت کی طرف جارحانہ پیش قدمی کیوں کی؟''

''کیا اس کی ضرورت تھی؟''

''ضرورت سے بھی زیادہ؟''

''جو ہونا تھا، اب ہو چکا۔''

''اور اب تمھیں نتائج بھگتنا پڑیں گے۔ اُنھوں نے تمہارے خاندان کا احترام کرتے ہوئے تمھیں گھر کے اندر آنے کی اجازت دی۔ تم یہ کتنی جلد بھول گئے؟ تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟ تم تو ایک کم حیثیت شخص ہو۔ تمھارے پاس نہ تو دولت ہے اور نہ ہی اچھی شکل کہ تم کوئی اہمیت رکھو۔ تمھارے اندر اُنھیں کون سی حیرت انگیز خوبی نظر آتی؟ ...... اور وُہ بنک کے امتحان والی بکواس کیا تھی؟ تم میں شرم تو ہے ہی نہیں۔ اور وُہ سارے سفید جھوٹ......''

''......؟''

''اگر اُن میں سے کسی کی دادی کے ساتھ ملاقات ہو جائے اور وُہ کچھ ایسے کہے 'ہماری آپ کے پوتے سے ملاقات ہوئی تھی۔ اُس نے بینک کے اپنے امتحان کے متعلق بتایا تھا۔ اُس کی ملازمت کیسے چل رہی ہے'، دادی کیا کہے گی؟ 'کون سا بنک؟ کون سا امتحان؟ وہ، بنک میں ملازمت؟ وُہ آپ لوگوں کے ساتھ جھوٹ بولتا رہا ہے!، شیخی بگھارتا رہا ہے۔ آوارہ کتوں میں اُس سے زیادہ عقل ہوتی ہے۔ وہ کہے گی...... کہے گی کہ نہیں؟''

''......؟''

''چناں چہ بوڑھا کہے گا۔ 'واقعی؟ سوچیں کہ ہم نے آپ کے احترام کی وجہ سے اُسے گھر میں دعوت دی، کھانا کھلایا اور سونے کو جگہ دی...... اور اُس نے میری بیٹی کی طرف نامناسب پیش قدمی

کی......تمھاری دادی تمھارے لیے یہ دنیا دوزخ نہیں بنادے گی؟ خاموش مت ہو! جواب دو!''

......

جب میں جاگا تو آسمان پر روپہلی روشنی تھی لیکن وُہ صبح نہیں لگ رہی تھی۔

اپنے ساتھ میری جنگ پھر بھڑک اُٹھی۔

''کس سے متعلق؟''

''اُس کے بارے میں......''

''ہم پھر وہیں لوٹ آئے ہیں؟''

''ہاں، کیوں کہ اُس عورت نے اپنے خاوند کو بتا دیا ہوگا۔ اُس نے پوری تفصیل بتا دی ہوگی۔''

بوڑھے کو پہلے بے عزتی محسوس ہوئی ہوگی پھر وُہ غصے سے پاگل ہوگیا ہوگا۔ وُہ آوارہ، وُہ بدمعاش! وُہ بے شرم......، وہ سگریٹ پر سگریٹ پیتے ہوئے ساری رات نہیں سویا ہوگا، وُہ زیادہ غصے میں آتا رہا ہوگا، اِس انتظار میں رہا ہوگا کہ میں صبح کو اپنی شکل دکھاؤں!

''تم واقعی ایسا سوچتے ہو؟''

''میرے خیال میں ایسے ہی ہے۔''

''پھر تم کیا کرو گے؟''

''اگر میری رائے لیتے ہو تو ہمیں اُٹھ کر لباس پہننا چاہیے اور یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

''ابھی تو پو بھی نہیں ہوئی۔ باہر اندھیرا ہے!''

''اور بھی بہتر ہے۔ صبح ہمارے لیے مشکل ہو جائے گا، بوڑھا گھات لگائے بیٹھا ہوگا۔''

''تو کیا ہمیں جلد نکل جانا چاہیے۔''

''فوراً۔ اِسی وقت۔''

''لیکن......''

''اِس سوچ میں وقت مت ضائع کرو۔ ہمیں ابھی نکل جانا چاہیے، ورنہ......''

میں سردی محسوس کرتے ہوئے بستر میں سے نکلا اور لباس پہنا۔ میں کانپ رہا تھا:

میرے ہاتھ، چہرے کے پٹھے، سب کچھ۔ میں خوف زدہ تھا کہ پکڑا جاؤں گا اور حالات مزید بگڑ جائیں گے۔ میں نے احتیاط کے ساتھ خواب گاہ کا دروازہ کھولا اور پنجوں پر چلتے ہوئے صوفے تک گیا۔ سفید دیواریں اُداسی کے ساتھ دیکھ رہی تھیں۔ جیسے پنجوں کے بل پر میں سیڑھیاں اُتر رہا تھا تو میں نے سیڑھیوں والے جنگلے کی ہتھی کو دیکھا۔ وُہ غصے سے مجھے گھور رہی تھی۔ نچلی منزل پر دروازے کی موٹھیں، دیواروں کے کونے، تمام فرنیچر، زندہ ہوگئے تھے اور تمام غصے میں تھے۔ ایسے لگ رہا تھا کہ وُہ بلند آواز میں چیخ کر کسی وقت بھی مجھ پر حملہ آور ہو جائیں گے۔

پریشانی سے کانپتے ہوئے، میں جلدی کے ساتھ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور دروازہ بند کیے بغیر تیز تیز چلتا گیا!

باہر بلا کی ٹھنڈ تھی۔ گلیاں کیچڑ سے اٹی ہوئی تھیں اور چاند کی منجمد روشنی میں موت کی خاموشی تھی۔ میں تیزی کے ساتھ چلتے ہوئے گھر سے دور ہوتا گیا، میں نے کچھ موڑ مڑے اور تنگ، بل کھاتی، کیچڑ سے بھری گلیوں میں بڑھتا رہا۔ کیچڑ والا پانی جوتوں کے سوراخوں میں سے اندر داخل ہوگیا تھا۔ میں اتنے موڑ مڑ رہا تھا اور اتنی گلیوں میں چل رہا تھا کہ مجھے پتا نہیں تھا کہ میں کہاں تھا۔ چھوٹے قصبے کے راستوں کو میں اچھی طرح نہیں جانتا تھا اور میں گم ہو چکا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ میرا کسی چوکیدار سے سامنا ہو جائے گا۔ چوکیدار مجھ سے پوچھ سکتا تھا: میں کہاں سے آ رہا ہوں، کس طرف جا رہا ہوں اور اتنی رات گئے گلیوں میں کیا کر رہا ہوں۔ میں کیا جواب دیتا؟ میں کس ہوٹل کا نام بتاتا۔ وہ سمجھتا کہ میں چور یا جیل کا بھگوڑا ہوں اور مجھے سیدھا پولیس سٹیشن لے جاتا۔ وہاں سچ ظاہر ہو جاتا۔ دادا کے دوست کو پیغام بھیجا جاتا اور بوڑھا فوراً وہاں پہنچتا۔ اُس نے پہلے ہی غصے میں ہونا تھا اور پھر یہ واقعہ۔

''یہ وہی ہے۔'' تیزی کے ساتھ اندر آتے ہوئے وہ کہے گا، گو وہ اپنا سانس بحال کرنے کی کوشش میں ہوگا۔ ''تم جانتے ہو کہ یہ کون ہے؟ یہ فلاں فلاں کا بیٹا ہے۔ تمھیں یقین نہیں آئے گا۔ نہیں آئے گا نا؟ پہلے پہل میں اُسے ایک بھلا نوجوان سمجھا تھا۔ میں اُسے گھر میں اپنی بیوی اور بیٹی کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ معلوم ہے اس نے کیا کیا؟''

میں کیا کہتا؟ وُہ مجھے حوالات میں بند کر دیتے۔ اور والدہ، دادی، تمام رشتے دار، وُہ

عورت جس نے والدہ کے لیے دروازہ بند کر دیا تھا، پھر والد، میرا خاندانی رہائش والا قصبہ اور کرہ ارض کو پتا چل جانا تھا کہ مجھے گرفتار کر دیا گیا ہے۔ میں ایسے ہی مر جاؤں گا۔ دادی بہت خوش ہو گی۔ ''میں نے کہا تھا نا۔ کہا تھا کہ نہیں؟'' وہ کہے گی ''میں نے کہا نہیں تھا کہ آوارہ کتوں کو اِس سے زیادہ عقل ہوتی ہے۔''

وہ کہیں گے: ''یہ فضلے سے بھرا لگتا ہے۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ یہ قاتل ہے۔'' اور کون کہہ سکتا ہے کہ کیا کیا ہے۔

میں نے گلی کے دوسرے کونے پر بڑے جثے والے ایک چوکیدار کا سایہ دیکھا اور جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ میں انتہائی خوف کے عالم میں تھا۔ وُہ کسی بھی لمحے مجھ تک پہنچنے والے تھے اور مجھے سیدھا پولیس اسٹیشن لے جائیں گے۔

میں ایک موڑ مڑا، پھر اگلا۔ مجھے چوکیداروں کی سیٹیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ سیٹیوں کی تیز آوازیں پیچھے سے آنے لگیں، پھر سامنے سے بھی آنے لگیں اور پھر دوسری دونوں اطراف سے بھی۔ میں ذہنی توازن کھو رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ قصبے کے تمام چوکیداروں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ایک بڑا مجرم گلیوں میں چھپتے ہوئے گھوم رہا ہے اور وُہ اِس ولن کو گرفتار کرنے کا عہد کر چکے ہیں۔ میں بازو والے اینٹوں کے ایک گھر کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اچانک ایک بڑا کتا نمودار ہوا۔ وہ اپنے سفید بڑے دانت نکالے، غراتے ہوئے میری طرف بڑھا۔ چوکیدار سیٹیاں بجاتے ہوئے ابھی تک میرے تعاقب میں تھے اور اب اُن کے ساتھی مقامی کتوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ میں آخر کار قصبے کے ساتھ ملے ہوئے کھیتوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ تازہ ہل چلی زمین نرم اور کیچڑ کی طرح تھی اور میں ہر قدم پر ٹخنوں تک اندر دھنس رہا تھا۔ کتے ابھی تک میرے تعاقب میں تھے اور چوکیدار بھی۔ میں بھاگ رہا تھا۔ مجھے دور زرد روشنی نظر آئی، ریلوے سٹیشن کا لیمپ۔ میں اُس طرف چل پڑا۔ کتے اب چند قدم ہی پیچھے تھے۔ میں اس خوفناک قبرستان میں سے، جو کتبوں سے بھرا ہوا تھا، بھاگ کر گزر رہا تھا۔ کچھ کتبے سیدھے تھے اور کچھ جھکے ہوئے تھے۔ مجھے خوف نے اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا اور میں پسینے میں نچڑا ہوا تھا۔

مجھے ایک دم ایک نظم یاد آ گئی۔ چھوٹی سی نظم جو مجھے بچپن میں یاد کرائی گئی تھی۔ میں نے

اِسے بیس یا شاید پچاس مرتبہ کتوں کی طرف منہ کر کے اونچی آواز میں پڑھا۔

''خاموش ہو جاؤ، ساکن ہو جاؤ اور اپنا تمام حوصلہ کھو دو۔''

جب ہم بچے تھے تو کتوں کے خلاف یہ ہمارا خاص منتر تھا۔ میں نے بچپن میں اِسے اِس اعتقاد کے ساتھ یاد کر رکھا تھا کہ یہ بھاگتے ہوئے کتوں کو روک کر اُن کے منہ باندھ دے گا لیکن کتوں نے کوئی توجہ نہ دی۔ جب اُن سے بچنے کی کوئی اُمید باقی نہ رہی تو میں سر کو ہاتھوں میں پکڑ کے گیند کی طرح زمین پر بیٹھ گیا۔ میں کچھ عرصہ اُسی طرح رہا۔ میں نے دوبارہ دوڑنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ میں کیچڑ میں گھٹنوں تک دھنس گیا۔ ایک پاؤں باہر کھینچا تو جوتا اندر رہ گیا جسے میں نے ہاتھ کے ساتھ کھینچا۔ پھر کالے بادلوں کو روشن کرتی بجلی چمکنے لگی۔ بہت ٹھنڈی ہوا چل پڑی اور ساتھ ہی موٹے موٹے قطروں والی بارش ہونے لگی۔ چند سیکنڈوں کے اندر اندر میں بھیگ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہوا نے تیز ہو کر بادل اُڑا دیے۔ چاند نکل آیا۔ اردگرد چھپڑیاں بن گئی تھیں جن میں سے روپہلی چاندنی منعکس ہو رہی تھی...... روشن، چمکتے ہوئی چھپڑیاں......

میں نے غور نہیں کیا تھا کہ کتے کب کے جا چکے تھے۔ میں کافی دور نکل گیا تھا اور قبرستان میں سے بھی گزر گیا تھا۔ میں ایک سڑک پر آ گیا تھا اور اپنی رفتار تیز کر کے دوبارہ ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ زرد روشنی ریلوے سٹیشن کے سامنے ایک زرد جھونپڑی میں سے آ رہی تھی۔ میں چلتے ہوئے اُس جھونپڑی کے پاس گیا اور کھڑکی میں سے اندر دیکھا۔

لوگ!

دو سنتری تختہ نرد کھیل رہے تھے۔ مجھے انسانی چہرہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ میں نے ایک طرز گنگنانا شروع کر دی۔ اندر گھس کر میرا جی اُنھیں گلے لگانے کو چاہا۔ میں ریلوے سٹیشن کے اندر چلا گیا۔

صبح آئی۔ سورج تیز روشنی کے ساتھ چمک رہا تھا اور یہ ایک دمکتا ہوا، بھیگا بھیگا، نکھا اور ایسا روشن دن تھا جو جنوب کا خاصا ہوتا ہے۔ گاڑی پورے چھ گھنٹوں کی تاخیر سے تھی۔ دن گرم ہونے کے باوجود میں سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ میرے دانت بج رہے تھے۔ میں کاؤنٹر سے ٹکٹ خرید کر واپس مڑا تو دادا کے دوست کے ساتھ میرا سامنا ہو گیا۔

ٹکٹ میرے ہاتھ سے گر گیا۔

لیکن......

''خدایا......لڑکے۔'' اُس نے کہا ''اپنی حالت تو دیکھو۔ کیچڑ کے اندر گر گئے تھے؟ بارش میں پھنس گئے تھے؟ بحرحال صبح گھر سے کب نکلے؟ میری بیوی بہت پریشان ہے۔ اگر ہمیں پتا ہوتا کہ تم نے صبح اتنا جلدی چلے جانا تھا تو رات کو تمھارے لیے ناشتہ ہی رکھ چھوڑتے۔ تم نے ٹکٹ خرید لیا ہے۔ ایک منٹ، مجھے بھی خرید لینے دو۔''

میں سکتے میں آ گیا۔

''چلو......ہم ریل گاڑی میں باتیں کریں گے۔ مجھے اچانک کچھ کام آن پڑا......!''

''تم ہائی سکول کا امتحان ضرور دو۔'' ہم ڈبے میں بیٹھ چکے تو اُس نے کہا ''کاغذ کا وہ ٹکڑا ضرور حاصل کرو۔ تم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ کیا ہو جائے۔ میرے خیال میں تمھیں اعلیٰ تعلیم کی طرف بھی توجہ دینا چاہیے۔ کیوں کہ تمھارے والد......''

مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میرے لیے اپنے آپ کو قابو میں رکھنا مشکل ہو گیا۔

''میرا یہی ارادہ ہے۔ یونیورسٹی ہی نہیں، یورپ کے امتحانات بھی......''

''تمھارے لیے یہی اچھا رہے گا۔ تمھارا مقصد بھی یہی ہونا چاہیے۔''

گھر پہنچا تو والدہ نے پہننے کو خشک لباس دیا، جڑی بوٹیوں کی چائے بنائی اور کمر پر گرم پانی کی بوتل کے ساتھ ٹکور کی۔

''اُس سے کچھ حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی۔ عبدالفتح سے ملے؟''

میرے خدا......میں تو بھول ہی گیا تھا......میں اس سلسلے میں تو گیا تھا۔

''اُس کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی۔'' میں نے جھوٹ بولا۔ ''لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ تمھارے خیال میں تمھارے پاس مالکی کے حقوق ہیں تو میں عدالت کو رجوع کروں گا'' اُس نے کہا۔

والدہ کی آنکھوں میں سے اُمید کی کرن جاتی رہی۔ بہنوں نے سر جھکا لیے۔ سب سے چھوٹی نے بڑی بہنوں میں سے ایک کو کہا۔

''مطلب یہ ہوا کہ یہ کوئی رقم نہیں لایا۔''

اُس کی عمر صرف چھ برس تھی!

(XIII)

میں واپس کھیتوں میں چلا گیا، خدا اور اُس کے پراسرار طریقوں کے متعلق سوچنے۔ بری چیزیں خدا کی طرف سے آتی تھیں اور اچھی بھی۔ اچھا مقدر خدا نے دیا تھا اور برا بھی۔ خدا فراخ دل ہو سکتا تھا اور کنجوس بھی۔ خدا کسی کو ہنساتا تھا تو رلاتا بھی۔ خدا نے تخلیق کیا، خدا نے برباد کیا اور خدا نے شیطان کو اپنی من مانی کرنے دی۔ اور ہم، اُس کے خادم، ہمیشہ نقصان اٹھانے والوں میں تھے۔

میرا ذہن ایسے دورُخی خیالات کی وجہ سے پراگندا رہتا۔ میں صرف بیس برس کا تھا اور میرا جرم اُس جلاوطن کا بیٹا ہونا تھا۔

اور دِن گزرتے رہے۔

ایک اتوار کی صبح ہم تینوں کا ٹولہ یعنی غازی، حسن حسین اور میں، کاروباری علاقے میں، کپڑے کے اُس کارخانے کے قریب جس میں ہم کام کیا کرتے تھے، ملے۔

یہ پرانی یادوں کو تازہ کرنے والے دنوں میں سے ایک تھا۔ پارچہ باف احمد اور رشاط بھی ہمیں آ ملے۔

''کیا ایک بازی لگانا چاہو گے، حسن حسین؟'' غازی نے پوچھا۔

حسن حسین اپنے چشمے کے شیشے کو رومال سے صاف کر رہا تھا۔

''کس چیز کی؟''

''تختۂ نرد کی۔گل بہار قوانین کے ساتھ۔''

''ٹھیک ہے۔شرط کیا ہوگی؟''

''سیرک ڈورین کی ڈبیہ۔''

''منظور ہے۔پیسے دکھاؤ۔''

دونوں نے اپنے پیسے میرے پاس جمع کرا دیے۔ہارنے والے نے بھری ہوئی ڈبیہ میز پر رکھنا تھی اور سب نے مل کر آخری سگریٹ تک پی کر ختم کرنا تھا۔

دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔احمد،رشید،میں اور ہمارے کام کرنے کے دنوں کے کچھ اور جاننے والے جمگھٹا کی شکل میں ہو گئے۔میں نے غور کیا کہ ایک آدمی ساتھ والی میزوں میں سے ایک پر،نیلی ڈانگری پہنے اور سیاہ چشمہ لگائے،بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔

''وہ آدمی کون ہے؟''میں نے احمد سے پوچھا۔''کیا وہ تمھارے کارخانے میں کام کرتا ہے؟''

''ہاں۔''اُس نے جواب دیا''تمھیں کیسے پتا چلا؟''

''تمھیں یاد ہے،جب ہم بھی وہاں کام کرتے تھے،تو ایک شٹل اڑا تھا......اُس نے کارخانے کے مالک کو للکارا تھا۔یہ وہی نہیں؟''

''ہاں۔یہ وہی ہے۔اُسے جنابِ عزت کہا جاتا ہے۔اُس نے بہت سی جگہوں پر کام کیا ہے۔ایک انتہائی ہنر مند آدمی۔اُس کی ایک بیوی بھی ہے۔بوسنیا کی کوئی عورت......وہ بھی کام میں تگڑی ہے۔اِس کا پتا نہیں کہ وہ کون ہے؟اُسے کُرد سمجھا جاتا ہے۔''

غازی اور حسن حسین اتنا شور کر رہے تھے کہ جنابِ عزت کو اخبار تہہ کر کے اُن کی طرف مڑنا پڑا۔اُس وقت غازی نے ایک دوہری چال چلی اور خوشی کے مارے شور کرنے لگا۔اُسے یقین ہو گیا تھا کہ ؤہ اب جیت جائے گا۔

ؤہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور اپنی چال کی خوشی منانے کے لیے ہر ایک کو سگریٹ پیش کرنے لگا۔حسن حسین اپنی قسمت کو کوس رہا تھا۔

غازی نے ایک دوہری چال چلی،پھر دوسری اور جب تیسری چلنے والا تھا تو جنابِ

عزت نے اُسے ٹوکا:

''وہاں نہیں،بیٹا۔ایسا مت کرنا......غلط چال۔''

غازی نے چال واپس کر دی۔

''ایسا کیوں ہے؟''

''ذرا سوچو کہ چالیں کیسی ہوں گی۔تم تیسری اور چوتھی چال میں پھنس کر بازی برباد کر دو گے۔''

جنابِ عزت نے تمباکو کا ڈبہ نکال کر سگریٹ بنایا اور اُس کے بعد بازی میں اپنی دلچسپی ختم کر دی۔

غازی دیر تک جھجک کا شکار رہا۔

''دُہرا تین تین۔''اُس نے آخرِ کار چال چلی۔''اور دہرا تین چار؟اب دہرا چار،دہرا چار ایک،دہرا چار دو اور دوسرے دو،چار!ہاہا!ایک چار ہمارے حسین کے لیے اور ایک چار میرے مستقبل کے بچوں کے لیے،اور......

حسن حسین کو اپنا تختہ مشق بنایا جانا پسند نہیں آیا۔

''ٹھیک!تم نے اپنی دوہری چال چل لی ہے۔آگے چلو۔''

ارد گرد لوگوں کے لیے یہ ایک تفریح تھی۔حسن حسین کی کامرس کالج کی لکیردار ٹوپی ایک طرف کو کھسک گئی تھی۔اُس نے غازی کو گالی دی۔

''دیکھو!اپنی زبان سنبھالو۔''غازی نے کہا''بدتمیزی پر نہ اُترو۔''

''میں اِس لعنتی بازو کو ختم کر دوں گا۔کھیلنا ہے تو صحیح طریقے سے کھیلو۔''

''تم جب چھوڑنا چاہو،چھوڑ دینا۔پیسے محفوظ ہیں......کیا تمھاری بات کو میں دھمکی سمجھوں؟چلو ٹھیک!اب دہرا پانچ،دہرا پانچ ایک،یہ اب دوسرا ہے،اور تیسرا......دہرا پانچ تین،سنو حسن،یہ کتنے پانچ تھے؟کیا یہ تیسرا تھا۔بتاؤ حسن،اب تک تیسرا پانچ تھا،تھا کہ نہیں؟''

جنابِ عزت ابھی تک سگریٹ بنا رہا تھا۔

تیسرا پانچ کھیلنے کے بعد غازی قابو میں آ گیا تھا۔حسن نے اپنی اچھی آنکھ سے کیفے

کے سروس والے دروازے کی طرف دیکھا۔

''معذرت کے ساتھ۔'' اُس نے بلند آواز میں پکارا۔ ''کیا اِس بھلے شخص کے لیے ایک چوتھا پانچ مِل سکتا ہے؟''

غازی جناب عزت کی طرف مڑا۔

''آپ نے اس وقت مداخلت کیوں کی؟'' اُس نے غصے سے پوچھا۔ ''یہ ہرگز آپ کا مسئلہ نہیں تھا۔ آپ اپنے خیال میں کیا ثابت کرنا چاہتے تھے؟''

''تم درست کہہ رہے ہو۔'' اُس آدمی نے کہا۔ ''میں معافی کا خواستگار ہوں۔ مجھے خاموش ہی رہنا چاہیے تھا۔''

اُس نے اپنا سگریٹ سلگایا اور ہمیں تمباکو پیش کیا۔ غازی ابھی تک غصے میں تھا۔ اُس نے تختہ نرد کو زور کے ساتھ بند کیا اور اُٹھ کر چلا گیا۔

اُس اتوار کے بعد میں باقاعدگی کے ساتھ کیفے پر جانے لگا اور جنابِ عزت کے ساتھ میری دوستی ہوتی گئی۔ اُس نے ایک عرصہ قبل مجھے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

ایک دِن میری باغیانہ شیخیوں کے دوران میں اُس نے مجھے ٹوکا:

''پھر کیا ہوا؟''

کیا وہ میری گفتگو نہیں سن رہا تھا؟ ناانصافی، عدم برابری، خدا، شیطان، یہ اور وہ......

''تمہارا مطلب ہے۔'' اُس نے بات جاری رکھی۔ ''کہ زمین پر ہر کسی نے، اور خدا نے، وہ سب کرنا ختم کر دیا ہے جو وہ کر رہے تھے، تاکہ تم مشکل میں پڑ جاؤ۔''

''کیا تم بے ہوش کرنے والی شراب لے رہے ہو؟''

''یقیناً نہیں۔ میں دوسروں میں سے اِسے نہیں نکالتا۔ تم نے اپنی باتوں سے میرے اوپر ایسا ہی تاثر چھوڑا ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ میں غلط ہوں۔ کیوں کہ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ کوئی اتنا انا پرست ہو۔''

''انا پرست کیا ہوتا ہے؟''

''وہ جو غرض ہو۔''

''خود غرض؟''

''کوئی ایسا جو اپنے آپ کو کائنات کے وسط میں تصور کرتا ہو اور محسوس کرتا ہو کہ کائنات کو خود کو اُس کے مطابق ترتیب دینا چاہیے۔''

''کیا میں ایسے ہوں؟''

''مجھے توقع رکھنی چاہیے کہ تم اِس رویے سے چھٹکارا حاصل کرلو۔''

''چناں چہ میں......''

''میں بہت خلوص کے ساتھ چاہتا ہوں کہ تم اِس سے چھٹکارا حاصل کرلو۔''

مجھے یہ اپنے چہرے پر تھپڑ لگا۔ کیا میں شرم کے مارے وہاں سے چلا جاؤں یا اُس کے ساتھ جھگڑا کروں۔

اُس نے مجھے فیصلہ کرنے کا موقع نہیں دیا۔

''مجھے تمہارے والد اور اُن کے سیاسی معاملات کے بارے میں معلوم ہے۔'' اُس نے کہا ''تم پچھلے چند دنوں سے خالی جگہیں پر کر رہے تھے۔ تم یقیناً زیادتی کا شکار ہوا اور میرے خیال میں ہر زیادتی کے شکار کو اپنے باغیانہ خیالات رکھنے کا حق ہے۔ لیکن میں مشورہ دوں گا کہ تم یہاں اُن لوگوں کے درمیان میں نہ آؤ جنھیں بغاوت کرنے کا تم سے زیادہ حق حاصل ہے، خود ترحمی میں لپٹ کر خالی پن سے بغاوت کی باتیں کرتے ہوئے۔''

میں مکمل طور پر اُس کے سحر میں تھا اور میں نے اپنے آپ کو بے بس محسوس کیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ مجھے کچھ نہ کچھ بولنا چاہیے۔

''ہم سب کے اپنے اپنے مسائل ہیں۔'' اُس نے بات جاری رکھی۔ ''مسائل سے پاک زندگی جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ خاص کر اس علاقے میں۔ یہاں رہنے والے لوگوں کے گمبھیر مسائل ہیں۔ خوراک ایک مسئلہ ہے، ایندھن ایک مسئلہ، نیند ایک مسئلہ ہے، تپ دق ایک مسئلہ، ملیریا ایک مسئلہ ہے اور خدا جانے اِس کے علاوہ کیا کیا ہے۔ میں تمہارے الفاظ دوہراتا ہوں...... یہ وہ علاقہ ہے جسے خدا بھول گیا ہے۔ یہاں متعدد لوگ ایسے ہیں جنھیں اُس کے ساتھ ناراض ہونے کا تم سے زیادہ حق ہے۔''

اُس نے اپنا سگریٹ سلگایا اور میرے اندر دلچسپی ختم ہوگئی۔

وُہ دن باقی دنوں کی طرح گزر گیا۔ ہم آپس میں باتیں کرتے رہے لیکن غیر اہم معاملات کے متعلق۔ دراصل اُسے اب مجھ میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اُس خطبے کے دس روز بعد اچانک اُس نے مجھے ڈانٹا:

''تم اپنے لیے ملازمت کیوں نہیں ڈھونڈ لیتے؟''

میں نے اُس سے پوچھا کہ ایک جلاوطن کے بیٹے کو اپنے دفتر میں کون ملازمت دے گا؟

''تم لکھ پڑھ سکتے ہو؟'' اُس نے کہا۔

''نہیں تو......''

''اگر تم لکھ پڑھ نہیں سکتے ہو تو تمہارے رشتے دار تمہارا خیال رکھتے ہوں گے۔''

''ہمارے رشتے دار مدد نہیں کرتے۔''

''نہ کرنے کی کوئی وجہ تو نہیں۔''

''وجہ نہیں ہے۔''

''کیا وُہ تمھارے والد کے نظریات سے اتفاق کرتے تھے؟''

''نہیں......''

''تو پھر......''

''ایمانداری کی بات ہے کہ مجھے معلوم نہیں کہ ہمارے لیے پیسے کہاں سے آتے ہیں۔ پتا نہیں کہ کون کیا کرتا ہے۔''

''تمھیں کوئی اندازہ نہیں کہ پیسے کہاں سے آتے ہیں؟ تمھیں کبھی تجسس نہیں ہوا؟ معلوم کرنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی؟''

''حالات اتنے مخدوش ہیں......''

''اور بھی ضروری ہے کہ پتا کرو کہ گزر کیسے ہوتی ہے۔ تم نے کبھی نہیں سوچا کہ پوچھو، والدہ، پیسے کہاں سے آتے ہیں؟ یہ خیال کبھی نہیں آیا؟''

''تمھارا بات کرنے کا عجیب سا ڈھنگ ہے۔''

''کیا ایسے ہی ہے؟''

وہ دن بھی گزر گیا۔ میں اگلے دِن بھی برہم تھا۔ میں کیفے میں نہیں گیا۔ میں اکیلا ہی اِدھر اُدھر سوچتے ہوئے، جمع تفریق کرتے ہوئے، اندازے لگاتے ہوئے، مٹرگشت کرتا رہا۔ ہر سوچ کے باوجود میں اگلے دِن وہاں چلا گیا۔ وہ وہیں تھا، اخبار پڑھتے ہوئے۔ ہم نے خوشگوار فقروں کا تبادلہ کیا۔ اُس نے اپنا اخبار ایک طرف رکھا اور پوچھا کہ میں گزرے ہوئے کل کہاں تھا۔

''کہیں نہیں۔'' میں نے کہا'' مجھے کچھ کام تھا۔''

''کام کیا تھا؟ اب مجھے یہ نہ بتانا کہ تم نے ملازمت کے لیے درخواست دی ہے؟''

''نہیں...... جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میرے پاس مڈل سکول کا ڈپلومہ بھی نہیں اور میں ایک جلاوطن کا بیٹا ہوں۔''

''میں نے تو صرف کہا تھا کہ نوکری حاصل کرو۔ تم نے اس کا مطلب لیا کہ جاؤ اور دفتر میں کام کرو۔''

''میں اور کیا کرسکتا تھا؟''

''دنیا میں صرف دفتر مزدور ہی نہیں۔ وُہ تو اہم حصہ ڈالتے بھی نہیں۔ اِس کے علاوہ زمین پر آدھے سے زیادہ لوگوں کے پاس مڈل سکول ڈپلومہ تک نہیں۔ اس کے باوجود وُہ سب کام کرتے ہیں، روزی کماتے ہیں، زندہ رہتے ہیں، جدوجہد کرتے ہیں اور جن کے پاس ڈپلومہ ہے اُنھیں زندگی گزارنے کا اہل بناتے ہیں۔''

میں اُس کے کہے کو مکمل طور پر سمجھ نہ پایا۔

''کیا یہ بات ایسے نہیں؟''

''درست......''

''سنو، میں دو نصیحتیں کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے، اُن مختلف کاموں کے متعلق سوچو جو لوگ کرسکتے ہیں اور اپنے لیے ملازمت کا بندوبست کرو۔ دوسرا، باتیں سننے کی عادت ڈالو اور دوسروں

کو بولنے کی اجازت دو۔ تم نے بیروت میں پلیٹیں دھوئیں جو تم یہاں بھی کر سکتے تھے۔ یا مجھے معلوم نہیں، تم جا کر دہی بھی بیچ سکتے ہو۔‘‘

میں ہنس پڑا۔

’’تم ہنس کیوں رہے ہو؟ یہ ایک انتہائی سنجیدہ مسئلہ ہے۔‘‘

’’اگر ہم کسی دوسرے قصبے میں ہوتے تو شاید کر لیتا، لیکن......‘‘

’’تم یہاں نہیں کر سکتے؟ تم ایسا کرتے ہوئے دیکھا نہیں جانا چاہتے؟ لوگ کیا کہیں گے؟ وہ سوچیں گے، وہ ایک ایسا عظیم انسان تھا اور اُس کے بیٹے کو تو دیکھو، کیا وہ نہیں سوچیں گے؟ وہ سب تمھیں حقارت سے دیکھیں گے......‘‘

’’......؟‘‘

’’تم اپنے آپ کو بہت اہم سمجھتے ہو۔ تمھارے خیال میں لوگوں کو تمھارے متعلق سوچنے کے سوا اور کوئی کام نہیں۔ یہ ایک بیماری ہے۔ یہ اُن لوگوں کی بیماری ہے جو گھوڑے سے اتر کر گدھے پر سوار ہو جاتے ہیں۔ اگر بہتر طریقے سے کہا جائے، گدھا ڈھونڈنے میں ناکام ہو جاتے ہیں اور آخر کار اُنھیں پیدل چلنا پڑتا ہے۔ تم اِس بیماری کا علاج کرو ورنہ یہ تمھیں برباد کر دے گی۔ اِس طرح آہیں بھرنا اور شکایت کرنا بے کار ہے۔ یہ تمھیں اپنے ذہن میں بھی چھوٹا کر دے گی۔ تم اپنے ذہن میں قید ایک قیدی بن جاؤ گے۔ تمھیں اِس پر غلبہ حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اِس کے علاوہ، تمھیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ میں تمھارے ساتھ یہ باتیں کیوں کر رہا ہوں۔ شاید تم مجھے ایک عجیب سا آدمی سمجھو۔ لیکن میں دیکھ سکتا ہوں کہ تم ایک ذہین نوجوان ہو۔ تمھیں اِس احساس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ انسانیت کو عقل مند نوجوان ذہنوں کی ضرورت ہے۔ میں اِسی لیے اتنا زور دے رہا ہوں۔‘‘

ہم پھر کیفے میں نہیں ملے۔ ہم نے کھیتوں میں ملاقاتوں کا طے کیا اور کھلی فضا میں ملتے۔

’’تمھیں اِس بھیانک خود ترحمی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے۔ یہ تمھیں اپنے ذہن میں قید کر دے گی۔ تم اپنے بھی دشمن بن جاؤ گے۔ یہ تمھیں برباد کر دے گی۔‘‘

’’لیکن مجھے کیا کرنا چاہیے۔‘‘

’’تمھیں اِس سوچ کو مات دینی چاہیے۔ کوشش کرو۔ پہلے نوکری حاصل کرو، کوئی بھی نوکری۔ نوکری شہر سے باہر ہو۔ کوڑا کرکٹ کھودنا، اِسی طرح کا کچھ بھی۔ تمھیں شاید لگے کہ یہ مشکل ہے لیکن اسے چھوڑنا نہیں۔ اسے کسی طرح جاری رکھنا۔ کوئی ایسا کام نہیں جسے کیا نہ جا سکے۔ اگر ذہن بنایا ہوا ہے تو یہ مشکل نہیں۔ اگر دوسرے کر سکتے ہیں اور تم نہ کر سکو تو یہ تمھارا رویہ ہو گا۔ تمھیں اِس رویے کو شکست دینی ہے۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ تم شہر کے وسط میں بھی کام کر سکتے ہو۔ ایک دِن تم غور کرو گے کہ تمھاری طرف کوئی توجہ نہیں دے رہا ہے اور تم نے اپنے قید خانے کی دیواریں ہمیشہ کے لیے گرا دی ہوں گی۔‘‘

میں نے اسے ہائی کورٹ کے سابق رکن کی بات سنائی کہ میں اُس کے گھر سے کیسے بھاگا تھا اور کیسے کتوں نے میرا تعاقب کیا تھا۔ وُہ ہنسنے لگا۔

’’تم اپنے خیالات کے دھارے میں بہہ نکلے۔ نہیں؟‘‘

’’تمھارے خیال میں، میں بدشکل نہیں ہوں۔‘‘

’’نہیں، ایسے بھی نہیں۔‘‘

’’یہ میری ٹیڑھی ناک؟ سوکھے ہوئے ہاتھ؟‘‘

’’اُنھیں بمشکل......‘‘

وُہ رکا اور پھر سنجیدگی سے بات جاری رکھی:

’’بہت سارے لوگ اپنی خامیوں سے واقف ہوتے ہیں۔‘‘ اُس نے کہا ’’لیکن اکثریت اُنھیں چھپانے کی کوشش کرے گی۔ اپنی خامیوں کو جاننا ایک قابل تعریف خوبی ہے اور اُن پر بات چیت کرنا دوسری خوبی ہے۔ خاص کر اگر تم اپنے رویے کے متعلق مثبت ہو سکتے ہو۔ شاباش، یہ بہت اچھا ہے۔‘‘

’’تم کہنا چاہتے ہو کہ میں بدشکل نہیں ہوں اور لوگ مجھ سے ڈر کر بھاگیں گے نہیں؟‘‘

’’یقیناً نہیں۔ اور تمھارا رنگ بھی بہت اچھا ہے۔ تمھارے پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ ان سب باتوں کے قطع نظر، اپنے لیے ملازمت ڈھونڈو۔ ٹھیک؟‘‘

تین دِن بعد مجھے شہر سے پینتالیس منٹ کے فاصلے پر بجری پر بیلچہ چلانے کا کام مل گیا۔

اگلی صبح پانچ بجے میں بائیس بکھرے ہوئے بالوں والے مزدوروں کے ساتھ دوہرے پچھلے ایکسل والے ڈاج ٹرک کے ریڈی ایٹر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ہم اپنے بیلچے اور کسیاں اٹھائے ٹرک کے پچھلے حصے میں سوار ہو گئے۔ میں نے، اُن پکے رنگ اور کھردرے چہروں والے لوگوں کے درمیان میں کھڑے جب کہ ٹرک صبح کی ٹھنڈ کو چیرتے ہوئے جا رہا تھا، سگریٹ سلگا۔ لگ رہا تھا کہ ٹرک اُڑتے ہوئے جا رہا ہے۔ میں بیلچے کو کندھے پر رکھے، سیدھا اور مضبوطی کے ساتھ پاؤں جمائے ہوئے کھڑا تھا۔ میں نیند میں ڈوبے ہوئے فارموں اور حویلیوں کے پاس سے گزرتے ہوئے حقارت کے ساتھ اُن کی طرف سگریٹ کا دھواں چھوڑ رہا تھا۔

ایک مزدور وسطی اناطولیائی لوک گیت گا رہا تھا۔

میں ایک جوش کی کیفیت میں تھا۔ یہ غازی اور میرے پہلی دفعہ کارخانے میں کام کرنے کے لیے جانے کی طرح تھا۔ میں شور کرنا، فارموں اور حویلیوں کو گالیاں دینا، دنیا کے لیے اعلان کر دینا چاہتا تھا، ہر ایک کو یہ بتا دینا چاہتا تھا کہ میں اب اپنی روزی کمانے جا رہا ہوں۔ میں کہنا چاہتا تھا: اپنا ڈپلومہ لے کر......

میں اپنی ٹیڑھی ناک، سکڑی ہوئی انگلیوں، سوراخوں والے جوتوں یا گھسی ہوئی پتلون کے بارے میں نہیں سوچ رہا تا۔ میرے ساتھیوں نے میری طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اُن سب کے پاس دوپہر کے کھانے کے تھیلے تھے اور اکثریت سگریٹ نوشی کر رہی تھی۔

ہمارا ٹرک آخر کار کام کرنے کی جگہ پر پہنچ گیا اور ہم نیچے اُتر گئے۔ میرے علاوہ وہ خاکی سورج سے پکے ہوئے، کھردرے آدمی کام سے واقف تھے۔ اُنھوں نے مضبوط ارادے کے ساتھ اپنے بیلچے اور کسیاں اٹھالیں۔ فورمین نے سیٹی بجائی اور ہم نے بجری پر یلغار بول دی۔ ہم میں سے کچھ نے اُسے کھودا اور کچھ نے ٹرک پر پھینکا۔ میں اُسے ٹرک میں پھینک رہا تھا۔ میں نے ایک اچھا اور موثر آغاز کیا تھا۔ میں اپنے پسینے کے ساتھ کمائی کر رہا تھا اور جو بھی کماتا، اُس کا حق دار تھا۔

میرے نزدیک کام کرنے والے نے میرے جوش کو دیکھتے ہوئے کہا:

''آرام سے دوست، آرام کے ساتھ، تمھیں رفتار کم کر دینی چاہیے۔''

لیکن میں نے دھیان نہیں دیا۔

میرے جوش کی رو نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ مجھے کندھوں میں درد محسوس ہونا شروع ہو گیا تھا۔ جیسے جیسے درد شدید ہوتا گیا، میرے لیے سانس لینا دشوار ہونے لگا۔ پھر میری پسلیاں تکلیف دینے لگیں۔

آخرِ کار ٹرک بھر گیا اور اُس کے بجری پھینک کر واپس آنے تک ہم آرام کر سکتے تھے۔ میں اپنے ساتھ بجری پھینکنے والے نوجوان کے ساتھ ایک چٹان کے نیچے بیٹھ گیا۔

''تمھارا نام کیا ہے؟'' اُس نے بے دلی سے پوچھا۔

میں نے اپنا نام بتا دیا۔

''اور تمھارا؟''

''میرا؟ میں 'شوگر' والی ہوں۔''

''تم کہاں کے رہنے والے ہو؟''

''میں؟ میں ییدیگلے کا رہنے والا ہوں۔ اور تم؟''

''میں مقامی ہوں۔''

''ہاں، میں ییدیگلے کا رہنے والا ہوں۔ میں پچھلے سال آیا تھا اور اُس سے پچھلے سال...... میں انقرہ گیا تھا...... تم یہ پہلی مرتبہ کر رہے ہو؟''

''ہاں۔''

''یہ ایک مشکل کام ہے، دوست۔ مت سمجھنا کہ تم اسے اِسی رفتار سے کرتے ہی رہو گے۔ تم کوئی میز، کرسی یا دفتر کے آرام دہ کام کا بندوبست نہیں کر سکتے؟''

''میں ایسا بندوبست نہیں کر سکتا۔ تم سمجھتے ہو کہ میں اِسے نہیں کر سکوں گا۔ تم اِسے کیسے کر رہے ہو؟''

''جو میں کر سکتا ہوں، تم اُسے کیسے کر سکو گے؟ میں نے تو ہمیشہ سخت کام کیا ہے۔ پرورش ہی ایسے ہوئی ہے۔ میرے باپ نے یہ کام کیا تھا اور اُس سے پہلے اُس کے باپ نے۔''

''تم کیسے جانتے ہو کہ میں نے مشکل کام کبھی نہیں کیا؟''

''اپنے ہاتھ دیکھو دوست۔ یہ ایک کلرک کے ہاتھ ہیں۔ اور تمھارا چہرہ اتنا سفید ہے۔ اِس نے تو سورج کی تپش دیکھی ہی نہیں۔ دوپہر کے کھانے پر کیا کھاؤ گے؟ تمہارے پاس روٹی یا کچھ اور نہیں ہے۔ اردگرد کوئی ریستوران بھی نہیں۔''

اُس سے پسینے کی بو آ رہی تھی۔

''پریشانی کی ضرورت نہیں، دوست۔'' اُس نے بات جاری رکھی۔ ''تم میرے حصے دار بن جانا۔''

تھوڑی دیر کے بعد ٹرک واپس آ گیا۔ میرے بازو، کندھے اور چھاتی درد کر رہے تھے۔ محسوس ہو رہا تھا کہ میں زخمی ہو گیا ہوں۔ ٹرک کے تیسرے چکر پر میرے بازو شل ہو گئے۔ لگ رہا تھا کہ کسی نے تمام رگیں کاٹ کے رکھ دی ہیں۔ میں بیمار، جڑا ہوا اور مائع جیسے محسوس کر رہا تھا۔ مجھے جسم بے جان محسوس ہو رہا تھا۔ میں کوشش کے باوجود اپنے بازو نہیں ہلا سکتا تھا۔ میں نے کام کرنا بند کر دیا۔

''میں نے تمھیں بتایا تھا۔'' شوگر والی نے کہا۔ ''دوست، تمھیں یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اب کام بند کرنا مناسب نہیں......''

پھر فورمین آ گیا۔ اُسے فوراً پتا چل جاتا تھا کہ کوئی بے کار بیٹھا ہوا ہے۔ وُہ اُنھیں کام شروع کرنے کو کہتا اور اُن کو پتھر مارتا۔ اُس نے مجھے بے کار بیٹھے دیکھ لیا اور ایک بڑا پتھر سیدھا میری طرف پھینکا۔

''تم نے کام کیوں بند کیا ہوا ہے؟ تم نے کام کیوں بند کیا ہوا ہے؟ ہم تمھیں دِن کا کام کرنے کی اجرت دے رہے ہیں۔''

میں نے ہلنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ فورمین نے مجھے گندی گالی دی۔ میں نے بھی گندی گالی سے جواب دیتے ہوئے بلیچہ پھینک دیا۔ ہر کوئی ہنسنے لگا۔ فورمین میرے پاس آ گیا۔

''یہ کام مشکل لگ رہا ہے؟'' اُس نے کہا۔ ''تم اباحضور کی حویلی میں ہی رہتے۔ اپنے خیال میں تم پکنک پر آئے ہو؟''

''میں یہ کام نہیں کروں گا۔''

''کیا کہا؟''

''میں نے کہا، میں یہ کام نہیں کروں گا۔''

''سخت کام تھا، نہیں کر سکے۔ تمھارے خیال میں یہ اباحضور کے کام جیسا کام ہو گا۔ میں یہ کام نہیں کروں گا! تم بھوک کے ستائے ہوئے نہیں ہو، کیا ہو؟ میں نے یہ کام نہیں کرنا۔''

میں جانتا تھا کہ یہ ایک احمقانہ عمل تھا، میں شہر کی طرف پیدل چل پڑا۔

جسمانی مشقت کھڈیوں پر کام کرنے سے زیادہ سخت تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ جو لوگ یہ کام کرتے ہیں اُن کے جسم میرے جسم کی طرح کے نہیں تھے۔ وُہ لوہے یا کسی اور چیز کے بنے ہوئے تھے۔

(XIV)

''مجھے کسی اور چیز کی توقع نہیں تھی۔'' نیلی ڈانگری والے میرے دوست نے کہا۔''تم نے سب سے سخت کام کا انتخاب کیا۔کوئی بات نہیں۔ جہاں تک فورمین کی باتوں کا تعلق ہے،اب ایسے لگتا ہے کہ اُس کا تم نے کوئی خاص اثر نہیں لیا۔ میں حیران ہوں کہ ایسا کیوں؟ اُس نے چند ایک تیکھی باتیں کی، کہیں کہ نہیں؟''

یہ سچ تھا...... میں نے اچانک محسوس کیا کہ میں اُن باتوں سے زیادہ پریشان نہیں تھا۔

''کیوں کہ۔'' اُس نے کہا''اِن سب باتوں کے باوجود تم اپنے آپ کو اُس سے بہتر سمجھتے ہو۔طبیعت پر وہی لوگ گراں گزرتے ہیں جو اپنے مقام اور رتبے کے ہوں۔ دوسروں کو اپنے سے بہتر سمجھنے پر رضامند نہیں کیا جاسکتا۔''

پھر،ایک دِن، نیلی ڈانگری والا آدمی غائب ہوگیا۔وہ کہاں سے آیا تھا؟ وُہ کون تھا؟ وُہ کیا چاہتا تھا؟

میں کبھی نہیں جان سکا۔لیکن اُس نے مجھے خاصا متاثر کیا تھا۔

''تمھیں غصے میں نہ آنا سیکھنا چاہیے۔'' اُس نے مجھے ایک دِن کہا تھا۔''لوگ غصے کو پسند نہیں کرتے،اُنھیں ہمدردی اور محبت کی ضرورت ہے۔ایک ڈاکٹر کی طرح بننے کی کوشش کرو۔ اپنے مریضوں کے ساتھ کبھی ناراض نہ ہونا۔ایک ایماندار کی محنت سے حاصل کی گئی کمائی حاصل کرو، بہت سی کتابیں خرید لو اور خوب پڑھو...... تمھیں میرے متعلق جاننے کی ضرورت نہیں۔ میں

بھی ایک انسان ہوں۔''

کچھ عرصہ بعد والدہ اور بہنیں کرایہ بنانے میں کامیاب ہو گئیں اور وُہ پہلا یک شام مجھے پہلے خدا اور پھر دادی کے حوالے کر کے والد کے پاس چلی گئیں۔

(XV)

میں آخرِ کار پرانی فیکٹری پر چلا گیا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ یہ وہی فیکٹری تھی جہاں غازی اور میں مشینوں پر کپڑا بنا کرتے تھے......لیکن اب کے میں اکاؤنٹنٹ بن کے گیا تھا!

میری ماہانہ تنخواہ چوبیس لیرا اور پچانوے کوُرس تھی اور مجھے اپنے ذہن میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ تنخواہ مجھے مکمل آزادی دے رہی ہے اور سفر کرنے، اپنی فیکٹری کھولنے، یہاں تک کہ اپنا بینک چلانے کی اہلیت بھی دے رہی تھی۔

میرے محکمے میں زیادہ تر لوگ لباس اور ٹائی کا انتخاب کرنے اور لڑکیوں کو عورتوں سے علیحدہ کرنے میں ماہر تھے۔ اُن سب نے اپنے بال چکنائی لگا کر پیچھے کو کیے ہوئے تھے اور ان کے قہقہے بے باک تھے۔ ابھی تک اُن کے دِل صحیح جگہ پر تھے۔ وُہ زندگی سے زیادہ سے زیادہ لطف کشید کرنا چاہتے تھے، خواہ شراب خانہ ہو، سرائے ہو یا چکلہ ہو۔ کتابیں تبھی کار آمد تھیں اگر اُن کے اندر تفصیلی جنسی مناظر ہوں یا لڑکیوں کے ساتھ گفتگو چلانے میں معاون ہوں۔ گو وُہ فیکٹری کے مالک، مینجنگ ڈائریکٹر یا چیف اکاؤنٹنٹ کے سامنے سر جھکا دیتے یا اُن کے ہتک آمیز فقرے سن لیتے لیکن شراب خانے کی ملازمہ یا ویٹر کے ساتھ اُن کا رویہ ظالم انسان جیسا ہوتا۔

میرا لائین مینجر میری ہی عمر کا آدمی تھا جس نے مڈل سکول آخری سال میں چھوڑ دیا تھا۔ وُہ لوہے کے تار کی طرح کھچا ہوا آدمی تھا۔

''میں یہ سب سیکھ لوں گا اور ایک دِن آخری سیڑھی تک پہنچ جاؤں گا۔''

اُس کا سیکھنے کا جنون ڈیپارٹمنٹ کے ہر آدمی کے اعصاب پر بھاری پڑ رہا تھا۔ اُسے شراب خانوں، سرائے یا چکلوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی اچھا لباس پہننے یا محبوبہ رکھنے سے۔ اُسے صرف سیکھنے کا شوق تھا، خواہ سیکھا ہوا اُس کے کام ہی نہ آ سکتا ہو۔

''میرا قد میرے باپ کی وفات کے وقت صرف اتنا تھا۔'' وُہ کہتا، ''میری ماں کو لوگوں کے کپڑے دھونا پڑے۔ مجھے گلیوں میں دودھ، دہی، پیسٹریاں، کاغذ بیچنا اور جوتے پالش کرنا پڑتے۔ یہ سب کرنے کے ساتھ ساتھ میں تعلیم بھی حاصل کر رہا تھا۔ اگر میری ماں بیمار نہ پڑ جاتی تو میں نے تعلیم جاری رکھنا تھی۔ میں نے سوچا کہ اس کی بیماری کی کوئی بھی وجہ ہو، میں اس کی پوری جان کاری لوں گا۔ اگر ایک آدمی تعلیم حاصل کر سکتا ہے تو دوسرا کیوں نہیں؟ آخر پروفیسر بھی تمھاری اور میری طرح کے انسان ہی تو ہیں۔''

وُہ الجبرا کے تمام فارمولوں کو آسانی کے ساتھ حل کر لیتا اور اُس نے تمام حساب کتاب، فیکٹری کے ہر ڈیپارٹمنٹ کے اکاؤنٹ، بجلی، اخراجات، دھاگے، مشینوں سے حاصل ہونے والی رقم اور ہر مشین کی سیٹنگ کو جاننا اپنے اوپر لازم بنایا ہوا تھا۔

اگرچہ اُس نے یہ راز ہر کسی سے چھپایا ہوا تھا لیکن میں نے اُسے کئی مرتبہ خون تھوکتے ہوئے دیکھا تھا۔ وُہ زیادہ آمدنی حاصل کرنے کے لیے ترقی کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے سوئٹزرلینڈ میں ہجرت کر جانا، زندگی کا مقصد بنایا ہوا تھا۔ میں اُس سے اکثر پوچھتا کہ فرانس، اٹلی، انگلستان یا امریکہ کے مقابلے میں سوئٹزرلینڈ ہی کیوں؟

''کیوں کہ،'' وُہ سمجھاتا ''میں سوئٹزرلینڈ کو دنیا کا مہذب ترین ملک سمجھتا ہوں، اس کے علاوہ وُہ سب سے اچھی گھڑیاں بناتے ہیں۔''

جس دن میں نے اُسے خون تھوکتے ہوئے دیکھا، میں فوراً سمجھ گیا کہ وُہ سوئٹزرلینڈ کیوں جانا چاہتا ہے؟۔ دیگر عوامل ایک طرف، میں اُس کی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش کو اتنا پسند نہیں کرتا تھا۔ وُہ جانتا تھا کہ میں ایک چھان بین کرنے والا قاری ہوں لیکن اُسے حیرت تھی کہ میں اپنی زندگی کے ساتھ کیا کروں گا۔

میں جواب میں اُسے یہ کہنا مناسب نہیں سمجھتا تھا: میرا ارادہ ایسا انسان بننے کا ہے جو

اچھی باتیں کرے۔

''اپنا وقت ضائع مت کرو۔'' وُہ ہمیشہ مشورہ دیتا۔ ''اپنے ارادے بلند رکھو اور وہاں تک پہنچنے کے لیے تعلیم حاصل کرو۔'' اور پھر وُہ فوراً مزید کہتا:

کوئی ہنر نہیں پیدا ہوتا، سو اب
بلند کرو خود کو دنیا سے

اکاؤنٹنٹ کے محکمہ میں ہمت نامی میرا ایک دوست، وکیل کا بیٹا تھا۔ وہ ایک پست قد، دبلا پتلا آدمی تھا جسے دیکھ کر سوکھی ہوئی گاجر میرے ذہن میں آ جاتی۔ وہ اس سوچ کے ساتھ خالی معدے وائین پیتا کہ اس کا وزن بڑھ جائے گا اور سارا سال اپنا سر منڈوا کر رکھتا کہ مختلف لگے۔ وہ میری عمر ہی کا تھا۔ وہ ابھی پرائمری سکول میں ہی تھا کہ اس کے باپ کی موت واقع ہوگئی۔ وہ پرائمری سکول کے دوسرے سال تک ہی اپنی تعلیم جاری رکھ سکا تھا اور پھر روزی کمانے کے لیے اسے سکول چھوڑنا پڑا۔

''میرا باپ ایک وکیل تھا۔'' وہ کہتا ''میں ساری زندگی دو ٹکے کا کلرک نہیں رہ سکتا۔ کوئی آدمی مجھے توجہ دینے کے لیے تیار نہیں اس لیے مجھے خود ہی ایسے اقدام کرنے ہیں جن کی بدولت مجھے اہمیت دی جائے۔''

پھر وہ مزید کہتا کہ اسے ایسا کرنے کے طریقے آتے ہیں۔

''جب میں ایک پیالہ پی لوں تو اپنے آپ کو صحیح معنوں میں عظیم سمجھنے لگتا ہوں۔ تب کوئی جھجک نہیں ہوتی اور نہ کوئی رکاوٹ۔ ہر کوئی اپنے کام روک کر میری بات سنتا ہے۔ مجھے ایک نصیحت کرنے دو: دوسرے لوگوں کو اپنی بات میں دخل نہ دینے دو! تمھیں بغیر رکے بولے چلے جانا چاہیے۔''

''اور پھر؟''

''میں اپنے تجربے کے نتیجے میں بتاتا ہوں، لوگ تمھارے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ تم انھیں ہر طرح کی باتیں سناؤ، جو الفاظ تمھیں آتے ہیں استعمال کرو، انھیں تمھاری کی ہوئی باتوں کی سمجھ بھی نہیں آ رہی ہوگی، میرا یقین کرو، اس کے بعد وہ یاد رکھیں گے کہ تم کون ہو! بات یہ

ہے کہ اسی فیصد لوگوں کو اس میں دلچسپی نہیں کہ کہا کیا جا رہا ہے، لیکن انھیں صرف اتنا یاد رہتا ہے کہ بول کون رہا ہے اور باتیں کیسے کی گئیں۔''

وہ فیکٹری کے فالتو پرزوں والے حصے میں کام کرتا تھا اور میری طرح اس کی ماہانہ تنخواہ چوبیس لیرا پچانویں کورُس تھی لیکن اسے سٹاک میں موجود دو ہزار اشیا میں سے ہر ایک کی قیمت کا علم تھا۔ وہ دماغ پر زور دیے بغیر کہہ سکتا تھا کہ کتنی چیزیں آئی ہیں اور کتنی نکل چکی ہیں اور سٹاک میں کتنی موجود ہیں۔

وہ ہر صبح میرے لیے ایک تقریر لے کر آتا۔ مجھے گودام کے ایک کونے میں لے جاتا اور انجن کے تیل کی بو اور مشینوں کے پٹوں کے درمیان میں میرے ساتھ باتیں شروع کر دیتا۔ وہ ایک اطمینان کے ساتھ اپنی تقریر ختم کرتا اور ماتھے پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے پوچھتا:

''یہ گفتگو ایک تقریر کے لیے کیسی تھی؟''

اگر گفتگو مجھے پسند ہوتی تو چائے پلاتا اور اگر مجھے پسند نہ ہوتی:

''تم''، وہ کہتا۔ ''ابھی ان باتوں کو سمجھنے کے لائق نہیں ہوئے۔''

اگر میں اپنی بات پر قائم رہتا تو وہ ناراض ہو جاتا اور ایسے لمبے سے لفظ کے معنی پوچھتا جو اس نے اپنی تقریر میں کئی مرتبہ استعمال کیا تھا۔ مجھے علم تھا کہ اس نے یہ الفاظ اپنے باپ کی حوالوں کی کتابوں میں دیکھے ہوں گے، لغت میں اس کے معنی ڈھونڈے ہوں گے، انھیں یاد کیا ہوگا اور ان کے متعلق مجھے سوال کیا ہوگا تاکہ اپنے علم سے مرعوب کر سکے۔

عام طور پر میں اس کی تقریر کی تعریف کر دیتا اور کہتا کہ ''میں کسی بہتر تقریر کا تصور بھی نہیں کر سکتا'' تاکہ مجھے اس کی پیچیدہ وضاحتیں نہ سننا پڑیں۔

''میں محسوس کر سکتا ہوں کہ تم اب سمجھدار ہونا شروع ہو گئے ہو۔''

مجھے اب دوسرے لوگوں کو باتیں شروع کروا کر سننے میں لطف آنے لگا تھا۔ اس تبدیلی سے میرے کئی دوست بن گئے تھے اور میں خود کو ہر دلعزیز ہوتے محسوس کرنے لگا۔

اکاؤنٹس کے محکمے میں کئی اور آدمیوں کے ساتھ میری دوستی ہو گئی جن میں طور خان اور مصطفیٰ قابلِ ذکر ہیں۔

یہ دونوں ایک میز پر بیٹھے ایک ہی کام کرتے تھے۔ دونوں گہرے دوست تھے اور کبھی کبھار انھوں نے ایک دوسرے کے گریبان پکڑے ہوتے۔ طور خان نے آخری سال میں ہائی سکول چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایک دیوالیے تاجر کا بیٹا تھا۔ وہ مرجھایا ہوا، دبلا پتلا تھا اور اس کی ناک ٹیڑھی تھی، لیکن اسے یہ وہم تھا کہ وہ بہت خوبصورت تھا۔ اس کی دراز یوڈی کلون، بالوں کی کریم اور مائع ویزلین سے بھری ہوتی۔ وہ ہمیشہ آئینہ تھامے، اپنے آپ کو تازہ رکھتا اور موچنے سے بھویں درست کرتا رہتا۔ وہ اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو احتیاط کے ساتھ دیکھتا اور اگر محسوس کرتا کہ اسے اپنے آپ کو سنوارتے ہوئے دیکھ لیا گیا ہے تو ناراض ہو جاتا، بحث کرتا اور لوگوں کے ساتھ بولنا بند کر دیتا۔

• مصطفیٰ بالکل مختلف تھا۔ طور خان کے برعکس وہ زیادہ پرسکون تھا، وہ مذاق کرتا، قہقہے لگاتا اور اُس کے ساتھ بات چیت کرنے میں مزا تھا۔ وہ صرف پرائمری سکول تک ہی تعلیم حاصل کر سکا تھا۔ وہ طور خان کی جی حضوری کرتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے پھرتا۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا کہ وہ ایسے کیوں کرتا ہے۔

''اس کے قریب رہنا میری مجبوری ہے۔'' اس نے وضاحت کی، ''جن عورتوں کو وہ پسند کرتا ہے وہ ہمیشہ مجھے پسند کرنے لگتی ہیں۔''

دراصل ان کی دوستی شراب خانوں اور وہاں سے لائی گئی عورتوں کے گرد گھومتی تھی۔

دونوں کو ایک ہی عورت کے ساتھ محبت تھی بلکہ طور خان عورت پر مرمٹا تھا اور عورت مصطفیٰ کی دیوانی تھی۔ مصطفیٰ ایک خوبرو آدمی تھا۔ طور خان ہمیشہ اس کی نقل کرنے کی کوشش کرتا اور ساتھ ہی وہ یہ برداشت بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کسی کو اس بات کا علم ہو۔

ایک دن وہ مصطفیٰ پر بغیر کسی وجہ کے بگڑ گیا۔ غصے کی وجہ سے وہ گلابی ہو گیا۔ اسی وقت مصطفیٰ نے جیب میں سے اپنا آئینہ نکال لیا۔

''اس میں دیکھو! تم کتنے بھیانک لگتے ہو؟'' اس نے اچانک آئینہ طور خان کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

طور خان پاگل ہو گیا۔ اس نے میز سے ہر چیز اٹھا کر ادھر ادھر پھینک دی: کتابیں،

پنسلیں، دوات، سیاہی چوس۔

اس کا تمام جسم غصے میں جکڑا ہوا تھا اور اکاؤنٹنٹ کے دفتر سے نکل جانے سے پہلے وہ رکا اور مڑ کر کہا۔

''حرامی، کسی دن میں نے تمھیں جان سے مار دینا ہے۔ یاد رکھنا!''

مصطفیٰ اس پر ہنستا رہا۔ طور خان کے چلے جانے کے بعد وہ سنجیدہ ہو گیا۔

''میں نے اچھا نہیں کیا۔ تمھارے خیال میں مجھے اسے منا کر لے آنا چاہیے۔''

''کس لیے؟''

''کیوں کہ وہ بدصورت ہے اور وہ اس چیز کو جانتا ہے۔''

میں اس کے پیچھے گیا۔ وہ دھاگوں کے گودام میں دو بکسوں کے درمیان میں بیٹھا خاموشی سے رو رہا تھا۔ میرے قدموں کی آواز سن کر وہ آنکھیں پونچھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا ہوا کہ تم آ گئے۔ میری آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے۔ تم ذرا دیکھو تو کیا ہے؟''

میں نے احتیاط کے ساتھ اس کی آنکھوں کا معائنہ کیا، ان پر پھونک ماری اور اس کی اس بات کو درست ہونے کا تاثر دیا کہ ان میں کچھ پڑا ہوا ہے۔

اس کے بعد طور خان نے ایک عرصے تک مصطفیٰ کے ساتھ بات نہیں کی۔ اس نے اکثر مجھے اپنی میز پر بلایا۔

''دراصل۔'' وہ مجھے کہتا، ''جاہل اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کے ساتھ کام کرنا تکلیف دہ بات ہے۔ میری یہی دعا ہے کہ میں امتحان پاس کر کے یونیورسٹی میں چلا جاؤں۔''

جب وہ ایسی بات کرتا تو کن اکھیوں سے مصطفیٰ کو بھی دیکھتا اور اگر مصطفیٰ کوئی توجہ نہ دیتا تو برا منا جاتا۔

''وہ جاہل ہے۔'' وہ کہتا، ''بے وقعت لوطی۔''

ایک مرتبہ مصطفیٰ نے کمرے کے دوسری طرف اپنے ایک دوست کو آواز دی۔

''جانتے ہو؟'' اس نے کہا، ''میں جلد ہی ہالی وڈ جانے والا ہوں۔''

''ہالی وڈ؟ واقعی؟''

''ہاں، واقعی! مجھے میٹرو گولڈن میئر کی طرف سے پیش کش ہوئی ہے اور میں اداکار بننے والا ہوں۔ لگتا ہے انھیں نئے ہیرو کی تلاش تھی۔''

طور خان ایک دم گلابی ہو گیا، پنسل پھینکتے ہوئے باہر نکل گیا۔ مصطفیٰ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

''دیکھو۔'' جب دونوں کے درمیان میں صلح ہو گئی تو طور خان نے مجھے کہا۔ ''آج ہم شراب خانے میں تمھاری صحت کا جام پینے جا رہے ہیں۔ تمھیں ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔''

''میں؟'' میں نے جواب دیا۔ ''میں ساری زندگی شراب خانے میں نہیں گیا ہوں۔ مجھے ناچنا بھی نہیں آتا۔''

''کوئی مضائقہ نہیں۔ تم صرف ایک بیئر پینا اور پرندوں پر آنکھ رکھنا۔ میں اپنی محبوبہ کے ساتھ تمھارا تعارف کراؤں گا۔ تم اس کے ساتھ ملاقات کا انتظار کرو...... وہ ایک خاص چیز ہے۔''

اس دن کام کے اختتام پر ہم تینوں اکٹھے نکلے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ میں شراب خانہ میں گیا تھا۔ میں اونچی آواز والی موسیقی، سگریٹ کے دھوئیں، شراب کی خوشبو، رنگا رنگ لباس اور عورتوں سے بہت مرعوب ہوا۔ اچانک مجھے اپنے حلیے، لباس اور ناک کا خیال آیا۔ مجھے پہلے کی طرح تو محسوس نہیں ہوا لیکن پھر بھی میں نے اپنے آپ کو بدوضع اور اجنبی محسوس کیا۔

ہم نے بیئر کی مانگ کی۔ وہاں حیران کر دینے والی بھگدڑ تھی جس کا ہمارے ساتھ کوئی واسطہ نہیں تھا، شراب خانے کے مالک کی آنکھوں میں خوف تھا اور خدمت گزاروں کی مصروفیت میں گم حرکت۔ چند میزوں کو کھینچ کر ڈانس والے فرش کے ایک طرف لگا دیا گیا تھا۔ خدمت گزاروں نے جلدی سے میزیں تیار کر دیں۔ چھریوں، کانٹوں اور پلیٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ خدمت گزار لوگوں کے ہجوم میں سے راستہ بناتے ہوئے آ جا رہے تھے، شراب خانے کا مالک، اپنے لباس میں نفیس اور اتنا کم عمر لگ رہا تھا جیسے بیس سے بھی کم ہو، بے چینی کے ساتھ میزوں کے گرد پھر رہا تھا اور اپنے عملے کی پریشانی کے ساتھ نگرانی کر رہا تھا۔ میزوں کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد وہ

بینڈ کی طرف مڑا:

''ناچ کے لیے کچھ شروع کیا جائے!''

بینڈ دھن بجانے لگا، وہ پھر ناچ کے فرش کے درمیان میں لہراتا ہوا آیا اور شراب خانے کی لڑکیوں نے تالیاں بجائیں۔

''میرے خیال میں بھاری جتھے آ رہے ہیں۔''

''بھاری جتھے کون ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تمھیں پتا چل جائے گا۔''

اگلے ہی لمحے باہر والا دوہرا دروازہ پورا کھلا، بھاری اور طاقت ور نظر آتے آدمیوں کا گروہ اندر داخل ہوا۔ مجمع نے ان کو گزرنے کے لیے راستہ دیا اور ہر کوئی، جن میں شراب خانے کا مالک اور عملہ شامل تھا، حیرت میں کھڑے تھے۔ شراب خانے کی لڑکیاں بھی کھڑی ہو گئیں۔

''یہ لوگ بہت خرچ کرنے آتے ہیں۔'' طور خان بڑبڑایا۔ ''بہت زیادہ۔''

''غور سے سنو۔'' مصطفیٰ نے کہا ''کون سی یونیورسٹی ایسا ڈپلومہ دے گی جو تمھیں یہ سب دے۔''

''میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ انھیں یہ بھی نہیں پتا کہ کیپ آف گڈ ہوپ کہاں ہے، اگرچہ......''

''دوست! اتنی دور جانے کی ضرورت نہیں، تمھیں صرف یہ پوچھنا چاہیے کہ آٹھ کتنی مرتبہ نو ہوتا ہے؟''

میں خاموش رہا...... لیکن کیا یہ مقدر ہے...... میں نے یہ سب انھیں دیا؟

پھر اچانک مجھے نیلی ڈانگری والا اپنا دوست یاد آ گیا اور اس کے الفاظ کہ ایسی سوچ مجھے مزید اذیت میں مبتلا کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں دے گی۔

آدھی رات تک امیر آدمیوں کی شراب نوشی جنون کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ عورتوں کو غیر مہذب طریقے سے ٹٹولا، مرطوب بوسوں، کھردرے طریقوں کے ساتھ لپٹایا اور دبایا جا رہا تھا۔ آخر کار انھوں نے فیصلہ کیا کہ بہت ہو چکا اور بل پیش کرنے کو کہا۔ کون سا بل؟ انھوں نے ہیڈ ویٹر

کے دیے ہوئے کاغذ کو ایک نظر بھی نہ دیکھا۔ ہیڈ ویٹر پوری شام الین کی میز پر جانے والی ہر چیز کو لکھے جا رہا تھا۔ سونے کی انگوٹھیوں سے لدے ہوئے ہاتھ بٹوؤں میں گھس گئے جہاں سے نوٹوں کی بھاری گڈیاں باہر نکلیں۔ آدمیوں نے پانچ سولیرا کے نوٹ الگ کیے۔ انھوں نے نوٹ شراب خانے کے مالک کی طرف پھینکے۔ وہ ہکا بکا کھڑا تھا۔ کوئی بھی آدمی نہیں چاہتا تھا کہ دوسرا ادائی کرے لیکن پھر انھوں نے معاملات طے کر لیے۔ شراب خانے کا مالک عمدہ لباس میں ہونے کے باوجود گھٹنوں کے بل فرش پر رینگ رہا تھا جیسے پانچ سولیرا کے نوٹ جنھیں وہ اکٹھے کر رہا تھا، مقدس صحیفے ہوں۔ پھر اس نے چمکتی ہوئی پلیٹ میں ریزگاری رکھ کر انھیں پیش کی۔ وہ ریزگاری واپس لینے پر رضامند نہیں تھے اور اس چھوٹی جاگیر کو ٹپ کے طور پر دے کر جانے کو تیار ہوئے۔ شراب خانے میں ہر کسی نے کھڑے ہو کر تالیاں بجائیں۔

بینڈ نے لومڑی ناچ (Fox trot) بجانا شروع کر دیا۔ شراب خانے کو اچانک جیسے اپنا آپ یاد آ گیا ہو اور یہ بھی کہ وہ ایک شراب خانہ ہے، ایک دم زندہ ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد طور خان اور مصطفیٰ کی مشترکہ محبوبہ اپنی انگیا کو درست کرتے ہوئے ہماری میز پر آ گئی۔ اس نے طور خان کے جبڑے کو سہلایا اور مصطفیٰ کو آنکھ ماری۔ طور خان جو آنکھ مارے جانے سے بے خبر تھا، اپنے آپ پر خوش نظر آیا، اس آدمی کی طرح جسے احساس ہو کہ اسے پیار کیا جا رہا ہے۔

عورت کرسی کھینچ کر وہاں بیٹھ گئی۔ وہ اپنے میک اپ کو تازہ کرنے لگی۔

''تم میرے ساتھ ناراض تو نہیں؟'' اس نے طور خان سے پوچھا۔

طور خان خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ وہ فوراً میری طرف جھکا۔

''تم نے اس کی بات سنی؟'' اس نے پوچھا۔ ''وہ مجھ سے پوچھ رہی ہے کہ کیا میں اس کے ساتھ ناراض ہوں! میں نے تمھیں بتایا نہیں تھا...... اسے عزت کرنا آتا ہے۔''

طور خان تھوڑی دیر بعد جب غسل خانے میں گیا تو مصطفیٰ تھوڑا سا جھکا۔

''اس نے ابھی تم سے کیا کہا؟ کہ اس نے احترام کا مظاہرہ کیا؟ تھوڑی دیر انتظار کرو۔ پھر دیکھنا کہ کیا ہوتا ہے؟''

اور میں نے انتظار کیا۔طورخان نشے میں آ گیا۔ پہلے اس نے اپنا سر میز پر رکھا پھر وہ اپنی کرسی پر آگے پیچھے جھومنے لگا اور پھر وہ گرنا شروع ہو گیا۔وہ شراب خانے کے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔وہ فرش پر سیدھا لیٹے ہوئے قہقہے لگا رہا تھا، کانپتی ہوئی انگلی کے ساتھ ہوا میں دائرے بنا رہا تھا اور گلابی لباس والی عورت کا نام پکار رہا تھا۔

عورت نے مصطفیٰ کے ساتھ راز و نیاز شروع کر دیئے تھے۔ میں طورخان کو اٹھانے کے لیے بڑھا۔

''مہربانی کر کے یہ تکلیف مت کرو۔'' اس نے مجھے کہا،''ایسی حالت میں وہ دنیا کا خوش قسمت ترین شخص ہوتا ہے خاص کر جب میں اسے اپنا جوتا دوں۔

پھر اس عورت نے اپنا نازک سا گلابی جوتا اتار کر طورخان کی طرف پھینکا۔طورخان نے اسے اٹھا کر اپنے چہرے اور منہ پر رگڑتے ہوئے چومنا شروع کر دیا۔

کیا اس طرح کے آدمی ہر آدمی پر مجھے ترس آنا چاہیے یا مایوس ہونا چاہیے۔

گلابی لباس والی عورت مصطفیٰ کے ساتھ ایک کمرے میں چلی گئی۔طورخان ابھی تک فرش پر لیٹا ہوا تھا اور اس جوتے کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا جو اس سے لے لیا گیا تھا۔وہ عورت کو آواز بھی دے رہا تھا۔ویٹر جھاڑو اٹھائے ہوئے آیا۔

''اٹھو!'' اس نے طورخان کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا''اٹھو، قابل نفرت حرامی!''

مجھے پتا نہیں، کیوں، لیکن میں نے اچھل کر ویٹر کو پرے دھکیل دیا۔میں بھی نشے میں تھا۔میرے خیال میں ویٹر درست تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کیا کہا یا اس کا جواب کیا تھا۔لیکن مجھے آخر کار اس کا کہا یاد آ گیا۔''دوست! میں بھی انسان ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ میری ملازمت میں شامل ہے لیکن کوئی حد ہوتی ہے۔میں اس آدمی سے تنگ آ چکا ہوں۔تم بھی تنگ پڑ جاؤ گے۔یہ ہر رات ایسے ہی کرتا ہے۔میری حاملہ بیوی کو تمام رات گھر اکیلے رہنا ہوتا ہے۔صرف اس لیے کہ روٹی کا ٹکڑا کما سکوں۔یہ درست نہیں۔''

اس کی تنی ہوئی بھنوؤں نے جھریوں والے چہرے کو تھوڑا اوپر کو اٹھایا ہوا تھا اور مجھے اس کی آنکھ میں آنسو نظر آیا۔

مصطفیٰ کا پیغام ملا کہ اس نے مجھے بلایا ہے۔وہ عورت کے ساتھ جس کمرے میں تھا، میں وہاں گیا۔گلابی لباس والی عورت اُس کی گود میں بیٹھی بچے کو چھاتی سے دودھ پلا رہی تھی۔ میں نے واپس مڑ جانا چاہا۔

''آؤ! آؤ!'' مصطفیٰ نے کہا۔''میں طورخان کی طرح حاسد نہیں ہوں۔ اگر تم چاہو تو میری محبوبہ کو تم بھی لے سکتے ہو۔''

میرے معدے میں حرکت ہوئی، دیواریں جھومنے لگیں، فرش ارد گرد گھومنے لگا، چھت چکر کھانے لگی۔میں بڑبڑایا کہ اتنی فراخ دلی کی ضرورت نہیں۔

گلابی لباس والی عورت پکاری''ماں!''

ایک چھوٹے قد، سیاہ رنگت والی عورت، ٹھوڑی کے نیچے سرپوش کس کے باندھے، دروازے میں سے داخل ہو کر کمرے میں آئی۔ گلابی لباس والی عورت نے بچہ اسے دیا۔وہ ابھی تک مصطفیٰ کی گود میں تھی اور اس نے نیچے اترنا مناسب نہیں سمجھا۔ ماں اپنی اور بیٹی کی وجہ سے شرمندہ سی بچے کو لے کر خاموشی کے ساتھ کمرے سے باہر چلی گئی۔

''خدایا! کل میں نے کافی زیادہ پی لی ہو گی؟''طورخان نے اگلے دن کہا،''پھر بھی، کافی مزا رہا''

''......؟''

''عورت کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے؟ پسند آئی؟''

''ہاں، اچھی نظر آئی......''

''وہ پیاری ہے، اتنا خیال رکھنے والی، خوش کرنے کے لیے تیار۔ وہ میرے لیے سب کچھ کر سکتی ہے......''

''......؟''

''پتا ہے، اسے میری کیا چیز پسند ہے؟ آنکھوں کا رنگ۔ وہ خوب صورت ہیں، نازک، بھوری......وہ مجھے بتاتی ہے۔''

میرے ذہن میں نہ تو طورخان کی بھوری آنکھیں تھیں، نہ گلابی لباس والی عورت اور نہ

مصطفیٰ۔ میرے ذہن میں وہ شرمیلی، چھوارے جیسے چہرے والی عورت تھی جو میری ماں کی یاد دلاتی۔ میں جب بھی اس کا سوچتا، مجھے خوف آنے لگتا۔

مجھے مصطفیٰ سے معلوم ہوا کہ وہ پستہ قد، عمر رسیدہ خاتون معلمہ رہی تھی اور اسے پنشن مل رہی تھی۔

(XVI)

ہمت نے سب کچھ ناراضی کے ساتھ سنا۔

''یہ ذلالت ہے۔'' اس نے اعلان کیا، ''مکمل ذلالت۔ ایک نسل زوال پذیر ہو رہی ہے۔''

میں نے پوچھا کہ اس نے ایسے کیوں کہا ہے۔

اس نے مجھے غصے کے ساتھ گھورا۔ پھر اس نے تاریخ کے سبق کا آغاز کر دیا۔ اس نے وسطی ایشیا کے ہمارے پرکھوں سے آغاز کیا، ہمارے روشن راستے کو تاریخ میں تلاش کیا۔ وہ اپنی تقریر میں گم ہو گیا۔ وہ اتنا گم تھا کہ اسے سانس لینے کا بھی ہوش نہیں تھا۔ اپنی گفتگو کو صحیح سمت میں رواں ہونے کے بعد وہ جوش میں آ گیا اور اس نے نظر نہ آنے والے ہدف پر ہوا میں بازو لہراتے ہوئے مکے مارنے شروع کر دیے۔ گفتگو کرتے ہوئے وہ جیسے طاقت صرف کر رہا تھا، لگ رہا تھا کہ ہزاروں کے مجمع سے مخاطب ہے۔

ہم سلطنتِ عثمانیہ کے زوال کے اسباب پر پہنچے کہ آہستہ سے دروازہ کھلا اور بڑی ناک والا مینجنگ ڈائریکٹر اندر داخل ہوا۔ ہمت کے لہراتے ہوئے بازو اور مکے والی کلائی منجمد ہو گئی۔

''پھر سے تبلیغ کر رہے ہو ہمت آفندی؟'' مینجنگ ڈائریکٹر نے پوچھا۔

''اور، جناب! آپ؟'' اس نے میری طرف مڑتے ہوئے کہا، ''آپ یہاں کیا کر رہے ہیں، کتنی مرتبہ آپ کو منع کر چکا ہوں؟ کیا میں یہ نہیں بتا چکا کہ کمپنی کے وقت میں

ذاتی معاملات پر توجہ دینا چوری کرنے کے مترادف ہے؟ میں جو کہتا ہوں اس پر توجہ کیوں نہیں دی جاتی؟''

''میں سامان کی فہرست......''

''خاموش! میں دروازے کے پیچھے سے سنتا رہا ہوں۔ سلطنت عثمانیہ کا زوال تمھارا مسئلہ نہیں ہے۔ تم اپنے زوال کی فکر کرو۔ حضرت! میری بات غور سے سنو! یہ تم لوگوں کے لیے آخری موقعہ ہے۔ لڑکو تم اپنے روزگار سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ تم اپنے نظریات، پراجیکٹ اور جتنے تناظر چاہو سوچ سکتے ہو لیکن کمپنی کے وقت میں نہیں۔ ہمیں ایماندار کارندوں کی ضرورت ہے، ایسے لوگوں کی نہیں جو کمپنی کا وقت چوری کریں جب کہ دوسرے کام کر رہے ہوں۔ جاؤ اور اپنا اپنا کام شروع کرو۔''

سچ تو یہ ہے کہ مینیجنگ ڈائریکٹر کی بات درست تھی کہ اس طرح تقریریں کرنا مناسب نہیں۔ اس معاملے میں میرا قصور کتنا تھا...... کسی نے بھی میرا ساتھ نہیں دینا تھا۔ مینیجنگ ڈائریکٹر کی بات جھٹلانا...... مجھے مہینے کے آخر میں چوبیس پچانوے کی ضرورت تھی۔

(XVII)

وقت گزرتا رہا، ہمت کمپنی چھوڑ گیا۔ مصطفیٰ اور طور خان لازمی فوجی ملازمت کے لیے چلے گئے اور میرا بالا افسر، جو سوئٹزرلینڈ چلے جانے کے متعلق کہا کرتا تھا، فوت ہو گیا۔ اور میں...... میرے پاس چوں کہ کرنے کو کچھ اور نہیں تھا، محبت میں گرفتار ہو گیا۔

جنگی جہاز بنانے والی فیکٹری کے پھاٹک کے سامنے سے گزرنے والا بجری والا راستہ تین حصوں میں بٹ جاتا تھا۔ اس کی شاخیں ان علاقوں کو چلی جاتیں جہاں کام کرنے والے رہتے تھے۔ شام کو چھ بجے یہ گلیاں کاروباری علاقے میں کام کرنے والے لوگوں سے بھر جاتیں: دھاگے کی فیکٹری سے لڑکیاں، ڈھیر لگانے والے، مزدور، کپڑا بُننے والے اور صفائی کرنے والی موٹی بوڑھی عورتیں......

گو ہمارا ڈیپارٹمنٹ شام سات بجے تک کام کرتا، میں ساڑھے پانچ بجے چھٹی کر کے فیکٹری کے سامنے سڑک کے پار کوآپریٹو کی ترش بو والے شراب خانے میں چلا جاتا۔ میں شراب خانے میں گلی کی سطح کے برابر والی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر، سرخ رنگ کے ہیرے جیسی وائین کے ساتھ بڑا گلاس بھر کر سگریٹ سلگا کر، آدھے گھنٹے کے بعد دھاگے کی فیکٹری سے نکلنے والی چہکتی ہوئی لڑکیوں کے ہجوم کو دیکھنے کے لیے تیار ہو جاتا۔

میں پہلا، دوسرا اور تیسرا گلاس اشکال تبدیل ہوئے بغیر پی جاتا، پھر میں محسوس کرتا کہ جیسے میں نشے میں آنا شروع ہوتا میری نظر دھندلانے لگتی۔ یہ ایک لطیف اور خوشگوار تاثر ہوتا اور

نہیں اس بے خودی کی کیفیت میں اپنے سوکھے ہوئے ہاتھوں اور ٹیڑھی ناک کے متعلق بھول جاتا۔

آدھے گھنٹے کو کیا ہوا؟ کیا میں اتنی جلد آٹھ گلاس پی گیا؟

لڑکیاں باہر نکلنا شروع ہوگئیں۔ ان کے کالے ایپرن گرد میں اٹے ہوئے تھے۔

لڑکیاں کاتنے والی پہیوں، کھڈیوں اور مشینوں پر کام کرتی تھیں۔ یہ لڑکیاں دو، تین یا بعض اوقات زیادہ کے ٹولے میں سر جوڑ کر بیٹھے ہوئے کام کرتیں۔ وہ تیز، متذبذب قدموں سے گزرتیں اور بعض دزدیدہ نظر سے دیکھ کر ایک دوسرے کو ٹھوکے مارتیں اور ہنستیں۔

ان میں سے ایک...... میں نے غور کیا کہ ہمیشہ وہی ہوتی...... بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ وہ بوسنینی تھی اور عمر تقریباً چودہ برس۔ وہ وہاں سے گزرتے ہوئے ہمیشہ ارداتاً مجھے دیکھتی اور پھر چند قدم چلنے کے بعد مڑ کر نظر ڈالتی، وہ ہر دفعہ مسکرا رہی ہوتی۔ وہ چلتی، رکتی، مڑتی اور مسکراتی، چل پڑتی، رکتی، مڑتی، مسکراتی تاوقتیکہ موڑ مڑ جاتی۔

مجھے یاد نہیں کہ میں شراب خانے سے نکل کر اس کے پیچھے کب لڑکھڑاتے ہوئے گیا۔

میں ٹیڑھی گلیوں سے مزدوروں کے گھروں کے درمیان میں سے زنگ آلود ڈبوں اور گلی ہوئی لکڑی کے ڈھیروں سے بچتا ہوا گرتے پڑتے چلتا رہا۔ لڑکیاں جو چند قدم آگے چل رہی تھیں، پرے کی شکل میں اکٹھی ہوگئیں۔

میرا اندر طوفانی سمندر کی طرح ابل رہا تھا۔

میری نظر اس کے سفید سوتی جوتوں اور کسی حد تک پتلی ٹانگوں پر اٹکی ہوئی تھی۔ اس کے کولہے ایک شکل میں ظاہر ہونے لگے تھے۔ ہم گرتے ہوئے اینٹوں کے گھروں کے درمیان میں سے ٹیڑھی اور تنگ گلیوں میں گزر رہے تھے۔ زیادہ تر گھروں کے سامنے مردانہ سی کرد عورتیں بیٹھے پیاز چھیل رہی تھیں، اپنے بچوں کو نہلا رہی تھیں یا انگیٹھیاں جلا رہی تھیں اور اپنے اردگرد بدبو خارج کر رہی تھیں۔ پھر ہم ایسے علاقے میں آ گئے جہاں سجے ہوئے ہال، آراستہ کھڑکیاں، بُننے میں مصروف عورتیں جو ایک دوسرے کو چٹکلے سنانے میں مصروف تھیں۔ یہ کریٹوں کا علاقہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ گلیوں میں کھلنے والی ان کھڑکیوں کے پیچھے کریٹن لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد تھی جو ہنس رہی تھیں اور ٹوٹی پھوٹی ترکی میں باتیں کر رہی تھیں تاکہ گزرنے والے انھیں سن سکیں۔ وہ ہمیشہ

دعوت بھری نظروں کے ساتھ دیکھتیں اور کہا جاتا تھا کہ خاصی شوخ ہیں، فراخ دل بھی۔ یہ کتنی فضول سوچ تھی۔ میں، جس کی عمر بائیس برس تھی، میری دوست صرف چودہ سال کی، میں نشے میں دھت اور صرف اس سے محبت کرتا تھا۔

ایک کھڑکی کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے پرشہوت قہقہہ سنائی دیا۔ اس طرف مڑے بغیر میں نے دیکھا کہ سفید پردے کے پیچھے جس پر غیر ہنرمندانہ طریقے سے گلابی، سبز اور ارغوانی کشیدہ کاری کی گئی تھی،، دو عورتیں ہاتھ تھامے کھڑی تھیں۔ میں جیسے ہی مڑ کر دیکھتا، وہ پیچھے ہٹ جاتیں اور جیسے آگے چلتا مجھے ان کی آواز سنائی دیتی، اتنی بلند کہ صرف مجھ تک پہنچ سکے۔

''او مسٹر! ایک منٹ یہاں آؤ۔ تمھیں سنانے کے لیے میرے پاس کچھ ہے!''

میں لڑکیوں کا پیچھا کرتے بوسنین علاقے میں چلا گیا۔

ایک زرد رنگت، دراز قد اور دبلے جولاہے نے، جس کا کوٹ اس کے کندھے پر لٹک رہا تھا اور نیند کی کمی کی وجہ سے آنکھیں نیم وا تھیں، گزرتے ہوئے، سیاہ، گھنی مونچھوں کے اوپر سے مجھے گھور کر دیکھا۔ بلکہ ایک لمحے کے لیے رک کر میرا جائزہ لیا۔ مجھے احساس تھا کہ موڑ مڑنے تک وہ مجھے گھور رہا ہے لیکن میں نے اسے مخل نہیں ہونے دیا۔ آخر کار میں بائیس برس کا تھا، محبت میں گرفتار تھا اور میری جیب میں چمکتا ہوا لوہے کا چاقو تھا۔ اسی دوران میں میری محبوبہ بائیں ہاتھ کے دروازوں میں سے جن پر گندگی کی تہہ اس طرح چڑھی ہوئی تھی کہ وہ خاکستری دھات جیسے لگتے تھے، ایک صحن میں داخل ہوگئی۔ مجھے اپنے تجسس کو چھپانے کی کوئی وجہ نظر نہیں آئی اس لیے میں وہیں رک گیا۔ میرے دائیں طرف گرد سے اٹا راستہ تھا جو شہر کو انگوری باغ والے علاقے سے ملاتا تھا۔ میں ادھر اُدھر بھاگتی چھپکلیوں کی پروا کیے بغیر صحن کی طرف منہ کر کے پرانی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ میں وہاں کچھ عرصہ کھڑا رہا۔

میرے دائیں طرف والے راستے پر ہر طرح کے لوگ انگوری باغ کی طرف جا رہے تھے...... پیدل، بائیسکلوں پر، گولی کی طرح کبھی کبھار گزرتا ہوا موٹر سائیکل، ہر ایک کو گرد کے بادل میں چھوڑتی ہوئی ایک آدھ شیورلیٹ کار۔ راکھ کی رنگت والی صابن کی فیکٹری کے پیچھے سورج غروب ہو رہا تھا۔ جس طرف بھی میری نظر گئی، مجھے گرد، پسینہ اور لوگ جلدی میں نظر آئے۔

تمام دنیا ہمارے گرد تحلیل ہو رہی تھی۔

مجھے پھٹے پرانے لباس میں متعدد دبلے، دراز قد آدمیوں، سفید سرپوشوں میں عورتوں، میری طرف شک یا غصے سے دیکھتے ہوئے نوجوانوں کا بمشکل پتا چل رہا تھا۔ وہ تمام صحن میں سے آ جا رہے تھے۔ مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔

ایک لڑکی نے میرے نزدیک آ کر ارد گرد دیکھا۔

''جناب۔'' اس نے کہا ''میری بہن کہتی ہے، اگر وہ مجھے چاہتا ہے، وہ کہتی ہے، مہربانی کر کے اسے کہو کہ میرا انتظار نہ کرے، وہ کہتی ہے۔ میں خوف زدہ ہوں، وہ کہتی ہے میرا باپ کسی بھی وقت مسجد سے آ جائے گا، وہ کہتی ہے، یا میرا بھائی واپس آ جائے گا۔ وہ کہتی ہے......''

''کیا تم اس کی سگی بہن ہو؟''

''نہیں......''

''پھر تم کون ہو؟''

''اس کی ہمسائی......''

میں وہاں سے چلا گیا، صرف اُس کے لیے اپنی محبت ظاہر کرنے کے لیے۔

میں انگوری باغوں والی سڑک پر ہو لیا۔ تقریباً ایک سو یا ڈیڑھ سو قدموں کے بعد میرا دماغ حرکت میں آ گیا۔ اس کے باپ کے آنے سے کیا فرق پڑے گا؟ اور بھائی کے بھی؟ کوئی فرق نہیں پڑتا! میں اس کے ساتھ شادی کرنے والا ہوں۔

چناں چہ میں واپس چلا گیا۔

اب شام ہو گئی تھی۔ مزدوروں کے آخری ٹولے میرے نزدیک سے تیزی میں گزر رہے تھے۔ راکھ جیسی، جست جیسی دیواروں والی صابن کی فیکٹری اندھیرے میں چھپ گئی تھی۔ میں پہلے والی جگہ پر کھڑے ہو کر، گرتی ہوئی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر، صحن کے دروازے میں دوبارہ دیکھنے لگا۔

اس طرح کے صحنوں میں دروازوں کی قطاریں ہوتی ہیں۔ ہر دروازہ ایک مزدور کے خاندان کے گھر کو جاتا تھا۔ صحن کے دروازے کھلے رہتے تھے۔ اس والے دروازے کی بلّی گل گئی

تھی اور لوہے کے کنڈے زنگ آلود تھے۔ لکڑی کو موسم نے اتنا نقصان پہنچایا تھا کہ پھٹے برابر یا سیدھے نہیں رہے تھے۔

جب مکمل اندھیرا ہو گیا تو کھڑکیوں کے سفید پردوں کے پیچھے روشنی ہونے لگی۔ بری طرح سے کھانستے ہوئے ایک آدمی گلی میں چکر کاٹ رہا تھا۔ کبھی کبھار آہستگی کے ساتھ ایک دروازہ کھلتا اور بند ہو جاتا۔ نزدیک کہیں ایک بچہ رو رہا تھا۔ اندھیرا اتر آنے کے ساتھ ہی لگا کہ علاقے میں زندگی رک گئی ہے۔ عمارتوں میں زندگی کی واحد نشانی کھڑکیوں میں سے چھنتی ہوئی زرد روشنی کی لکیریں تھیں۔

مجھے اب صحن نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں عمارت کے پیچھے والی گلی میں گیا۔ میری محبوبہ کی کھڑکی اس طرف کھلتی ہو گی۔ گلی میں سانس بند کر دینے والا تعفن تھا۔ میں نے اپنی محبوبہ کے سائے کو کھوج لیا۔ وہ ایک پردے کے پیچھے Jackstones کھیلتے ہوئے ادھر اُدھر ہل رہی تھی۔ میں شرابی ذہن کے ساتھ ہر طرح کے خیالات کے ساتھ اس کے سائے پر مرتکز تھا۔ مثال کے طور پر: میں ان کے دروازے تک جا سکتا تھا اور ''کیا حال ہے؟'' کہتے ہوئے گھر میں داخل ہو سکتا تھا۔ میرے ضمیر نے قطعاً ملامت نہیں کرنی تھی۔ میں اس کے دراز قد، اختصار پسند باپ کو بات کرتے سننا چاہتا تھا۔ اس وقت مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں پوری دنیا کو فتح کر سکتا ہوں اور میں یقیناً اس کے خون سے ہاتھ رنگ لیتا جو بھی راستے میں آتا۔ لیکن اصل میں، میں ایسا کچھ بھی کرنے والا نہیں تھا۔ اس طرح کے خیالات صرف میرے متخیلہ کا حصہ تھے کیوں کہ مجھے لڑکی کا احساس تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی قسم کے سکینڈل کی زد پر ہو۔

پھر میں نے اسے دوبارہ پردے کے پیچھے کھڑے دیکھا۔ میں نے تمام خیالات ذہن سے خارج کر کے اپنی توجہ کھڑکی کی طرف کر دی۔ میں چند منٹ اسی طرح ساکت کھڑا رہا۔ یک دم چوکیدار کے بھاری قدموں اور سیٹی کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ میں ساکت کھڑا رہا۔ مجھے چوکیدار کے آنے اور مجھے چور سمجھنے کا کوئی خوف نہیں تھا!

کئی گھنٹے گزر گئے۔

چاند کی چاندی کی پلیٹ خاموشی کے ساتھ ایک عمارت کے پیچھے ابھری۔ اس کی ٹھنڈی

روشنی میں گندی گلیاں روشن ہوگئیں۔ آسمان میں اپنے راستے پر چلتے ہوئے چاند دور کہیں غرق ہو گیا۔ ہر طرف پھر سے تاریکی چھا گئی۔ صبح نزدیک تر ہو رہی تھی۔ کسی حد تک نشے کی حالت میں اور تھکاوٹ سے چور، میں دادی کے گھر کی طرف چل پڑا۔

اس کی نیند اتنی کچی تھی کہ بلی کی چاپ بھی اسے جگا دیتی۔ میں نے پوری کوشش کی کہ پنجوں کے بل اس طرح چلوں کہ وہ جاگ کر میرے کان نہ کھینچے۔ میں دروازے کے قبضوں اور لکڑی کے فرش کی ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ کو نہ روک سکا۔ میں دروازے کے اندر داخل ہی ہوا تھا کہ سامنے دادی سیدھی ہو کے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بلب کی مدھم سی روشنی میں مجھے دیکھ رہی تھی۔

''مکار لڑکے! تمھیں میری پریشانی کا اندازہ ہے؟ میں ڈر رہی تھی کہ کسی گلی میں کسی نے تمھارے پیٹ میں چاقو نہ گھونپ دیا ہو۔ میں نے سوچا تھا کہ شراب کے نشے میں کہیں گر نہ گئے ہو...... میں بہت پریشان تھی۔''

میں جواب دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ جیسے ہی مجھے اپنی محبوبہ کا پردے کے پیچھے ادھر ادھر چلتے ہوئے مینڈیاں اچھالتے اور Jackstones کھیلنے کا خیال آیا، میرا کسی خوشی کی طرز کو سیٹی پر بجانے کو دل کرنے لگا۔

''مجھے نہ صرف یہ بتاتا ہے کہ اس کے پاس پیسے نہیں۔'' دادی نے کہا۔ ''اور شکایت بھی کرتا ہے کہ بہت کم کماتا ہے لیکن ہر رات شراب کے نشے میں احمق بن کر آتا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ اگر تمھارے پاس پیسے نہیں تو را کی کیسے خریدتے ہو؟''

اس کا یہی خیال ہے کہ نشے میں دھت ہونے کے لیے را کی پینا ضروری ہے اور ہر جام کے لیے پیشگی ادائی کرنا پڑتی ہے۔ یہ طریقۂ کار اس عورت کو سمجھانا آسان نہیں۔ میرے خیال میں وہ یہ کبھی نہیں سمجھ سکے گی کہ پیشگی ادائی کے بغیر بھی نشے میں ہوا جا سکتا ہے اور نہ ہی وہ یہ سمجھ سکے گی کہ مجھے فیکٹری میں کام کرنے والی لڑکی کے ساتھ محبت ہوگئی ہے۔ ایسی زندگی اس کے لیے اجنبی ہے اور نہ ہی وہ ہم خیال بننے کی کوشش کرے گی۔ وہ ایک ''بھلے آدمی'' کی ماں ہے اور ایک ''بھلے آدمی'' کی ساس۔ ''بھلے آدمی'' کا بیٹا اور وارث اتنا ''کیسے گر'' سکتا ہے کہ ''فیکٹری والی لڑکی'' میں دلچسپی لے۔ اگر میں اصرار کرتا، وہ مجھے عجیب سی نظر سے دیکھتی اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے

بھر جاتیں۔

''تم۔'' وہ کہتی، ''اپنی ماں کی طرح ہو۔ وہ بھی چوڑھے چماروں کے ساتھ دوستی رکھتی تھی۔''

مجھے یاد نہیں کہ میں بستر میں کب گھسا اور کب سو گیا۔

میں پو پھوٹنے کے جلد بعد جاگ گیا۔ آسمان ابھی گلابی تھا۔ میں ابھی تک مخمور تھا اور میرے ذہن میں اپنی محبوبہ کی مینڈیاں لہرا رہی تھیں جب وہ پردے کے پیچھے کھیل رہی تھی۔

میں تیار ہوگیا۔ جیسے میں باہر جانے لگا، دادی نے روک لیا ''تمھارے پاس چند کروس ہوں گے؟'' اس نے پوچھا۔ ''مجھے گرم کھانا کھائے ایک زمانہ ہوگیا ہے۔''

مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھ پر مکمل انحصار نہیں کرتی تھی۔

میں باہر والے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ میرے پاس پیسے کیسے ہونا تھے؟ میرے پاس اگر کچھ ہوتے تو میں اسے دے دیتا۔ میں اتنا سنگ دل بھی نہیں ہوں۔ میری دادی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ تنخواہ کے دن کا ایک ہی فائدہ تھا اور وہ تھا اُدھار کی تجدید کا۔

(XVIII)

یہ شام کا وقت تھا اور میں ایک بار پھر چھپکلیوں سے بھری دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے نشے کی حالت میں اس کے صحن کو دیکھ رہا تھا۔ ایک پستہ قد، کھجوری گالوں، پیاری شکل اور دانوں کے نشانوں والی عورت میرے پاس آئی۔

''تم اس کا انتظار کر رہے ہو؟''

''جی......'' میرا ہاتھ جیب میں چاقو پر چلا گیا۔

''کیا ہوا؟ تم نے جیب میں ہاتھ کیوں ڈال لیا ہے؟''

''کوئی وجہ نہیں......''

''سنو، سنو۔ تم ایک بے چاری، بغیر کسی دفاع کے عورت پر چاقو نکالنے لگے ہو؟''

''میں چاقو نہیں نکال رہا تھا۔''

وہ تھوڑا نزدیک آ گئی۔

''تم اس لڑکی سے پیار کرتے ہو یا صرف ایک کھیل کے لیے آئے ہو؟''

''میں اسے پیار کرتا ہوں۔''

''واقعی؟''

''میں خدا کی قسم کھاتا ہوں۔''

''مسئلہ یہ ہے کہ یہاں اور بھی ہیں جو اس سے پیار کرتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ

تمھیں اسے حاصل نہیں کرنے دیں گے۔ میرے خیال میں تم یہاں وقت ضائع کر رہے ہو۔"

"اور کون اسے پیار کرتا ہے؟"

"تم پوچھ رہے ہو کہ اور کون اسے پیار کرتا ہے؟ کیوں، تقریباً سب کے سب! یہ مزدوروں کا علاقہ ہے۔ وہ تمام ایک سمجھ دار جوان لڑکی پر فریفتہ ہیں۔"

"اگر اُسے ان میں دلچسپی نہ ہو۔ خوشی ٹھونسی......"

"میں یہ تو نہیں جانتی کہ اسے کسی میں خصوصی دلچسپی ہے۔ لیکن اس کا باپ ایک غصیلا آدمی ہے۔ اسے کوئی پروا نہیں کہ کس کو کس میں دلچسپی ہے یا کسی کے پاس بندوق یا چاقو ہے یا کچھ ایسا اور۔ اسے تم یہاں نظر نہ آؤ۔"

"وہ کیا کرے گا؟"

'میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ وہ کیا کرے گا لیکن میں یہ ضرور کہوں گی کہ بہتر ہوگا کہ وہ تمھیں یہاں نہ دیکھے۔ لڑکی کا ایک بڑا بھائی بھی ہے جو ہمارے والے کارخانے میں کپڑا بنتا ہے۔ یہ دونوں بچے پندرہ دنوں میں ایک مرتبہ اپنی کمائی کی آخری پائی تک اپنے باپ کو دیتے ہیں۔ وہ اپنے آبائی وطن میں ایک بااثر آدمی تھا۔ ضلع میں ہر کوئی اس سے خائف تھا۔ ہمارے بڑے بتاتے ہیں کہ اس نے کیسے چند سینکڑے کافروں کے سر تن سے جدا کر دیے۔ چناں چہ ان لوگوں کے موجودہ رہائشی علاقے کی وجہ سے اپنی رائے قائم نہ کرو۔ وہ ہر طرح کا کام کرنے کی اہلیت رکھتا ہے لیکن وہ کہیں کام کرے گا نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ ملازمت کرنا اس کے مرتبے کے شایان نہیں۔ تمھیں ان لوگوں کو دیکھنا چاہیے جو اس کی بیٹی کا ہاتھ مانگتے ہیں۔ ابھی کل ہی کورو کوپرو میں پنسار کا مالک یہاں آیا تھا، یہ...... جمال کے کیفے سے تھوڑا آگے والا۔ آدمی لڑکی کے لیے دیوانہ تھا۔ اس نے اچھے گھر، سونے کے کنگن، ہیرے کی بالیوں اور بے شمار لباسوں کا وعدہ کیا۔ کیا پتا اور کیا۔ تمھارے پاس کیا ہے؟ تم اس سے بہتر کیا دے سکتے ہو؟ تم غور کرو...... تم تو کہیں صرف ایک کلرک ہو......"

میں بے بس ہو گیا۔

"دیکھا! تم لاجواب ہو گئے ہو، ہے نا؟ کسی کارخانے میں ایک کلرک۔ تم دونوں کیا کرو

گے؟ تم لوگوں کے پاس کچھ نہیں ہوگا۔ نوجوان ہونا میز پر کھانا نہیں لا رکھتا۔ میں نے آدمی کو اپنے کانوں سے کہتے سنا، "اگر وہ ہاں کہہ دے" اس نے کہا، "میں فوراً حویلی اس کے نام کر دوں۔" تمھارا کیا کیا جائے؟ تم نے لڑکی سے بات کی؟ کیا وہ تمھیں پسند کرتی ہے؟"

"ہم نے بات نہیں کی۔"

"اگر تم نے اس کے ساتھ بات نہیں کی تو اس کے پیچھے یہاں کیوں پہنچ گئے ہو؟"

"میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ مجھے کچھ نہیں پتا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میں صرف اس کا پیچھا کر رہا ہوں...... میں بے بس ہوں۔"

"ترک کر دو، بیٹا، ترک کر دو۔ اس والی کے پیچھے کئی مرد چکر لگا رہے ہیں۔ وہ کسی اندھیری گلی میں تمھیں قابو کر لیں گے اور وہی تمھارا انجام ہوگا۔ اپنی زندگی کو اس طرح ضائع نہ کرو۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو تمھیں سونے میں تولنا چاہتے ہیں...... ایمان داری سے......"

اسی لمحے میری "محبوبہ" اپنے شہد کے رنگ والے لباس میں خوب صورت، صحن کے دروازے میں نمودار ہوئی۔ وہ ایک فاصلے سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ میری تمام امیدیں چکنا چور، میں وہاں سے ہٹ گیا۔ میں شرمسار سا گلی کا موڑ مڑ کر تیز تیز چلتا گیا۔

الوداع، میری خواہشو، میری شیریں امیدو، اوپر والے چاند، زنگ آلود ڈبو، لکڑی کے گلتے ہوئے ڈھیرو، الوداع! بلیو، کتو، اینٹوں کی دیواروں والے گھرو، مردانہ چہروں والی کرد عورتو، چھوٹی تنگ گلیو اور آخر میں، یقیناً آخری نہیں، میری پیاری، تمہاری مینڈیاں پردے کے پیچھے کمر پر جھولتی ہوئیں، الوداع!

دنیا میں تمام سونے پر لعنت!

میں اپنے اندر چلا گیا۔ میں شراب خانے میں نہیں گیا۔ اور نہ ہی اس کھڑکی میں، جہاں سے میں نظارہ کیا کرتا تھا۔ تلخ، اندھیرے اور اکتا دینے والے دن گزرتے گئے...... ایک سہ پہر...... میں اداس سا دوبارہ اپنی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ مالک میرے پاس آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ایک چھوٹی سی لڑکی فیکٹری کے پھاٹک پر میرا انتظار کر رہی ہے۔ میں باہر گیا۔ یہ وہی چھوٹی لڑکی تھی جس نے اتنے دن پہلے میرے ساتھ بات کی تھی۔ وہ میرے پاس اس طرح آئی جیسے اس دن آئی

تھی۔

''جناب۔'' اس نے کہا ''میری بہن نے کہا ہے کہ اس کا باپ رات کو عبادت کے لیے مسجد جا رہا ہے اور اس کا بھائی کام پر ہوگا۔ وہ کہتی ہے کہ آپ پیچھے والی کھڑکی پر آئیں۔ وہ آپ کو کچھ بتائے گی!''

''کون؟ وہ؟ معلوم نہیں...... کب؟ واقعی؟''

''میں قسم کھاتی ہوں!''

''کب؟ تم نے پیچھے والی کھڑکی کہا؟''

''جی ہاں۔ شام کی نماز کے آغاز کے بعد!''

مجھے اپنے اندر دیوار گرتے ہوئے محسوس ہوئی اور لگا کہ میں روشنی سے بھر رہا ہوں۔ میں بھاگنا، چیخنا اور تمام دنیا کو بتانا چاہتا تھا۔

میں نے کارخانے کے دربان کو سگریٹ پیش کیا، اور غیر مخصوص طریقے سے بھکاری کو چند سکے دیے۔ میں وہاں سے پنسار اور پھر حجام کے گیا۔ داڑھی منڈوانے کے عمل میں، میں بے چین ہونا شروع ہو گیا۔ میں استرے کے نیچے بے چینی سے ہل رہا ہوں گا کہ حجام رک گیا۔

''مہربانی کیجئے جناب! کیا آپ تھوڑی دیر سکون کے ساتھ بیٹھ سکتے ہیں؟ ہم کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائیں!''

''تم سمجھتے ہو کہ اس کا امکان ہے؟''

حجام نے مجھے حیرت سے دیکھا۔

''تم سچ مچ سمجھتے ہو۔'' میں نے وضاحت کی۔ ''کہ تمہارا استرا اتنا سنگ دل ہوگا کہ دنیا کے سب سے خوش آدمی کے گال کو زخمی کر دے گا؟''

حجام نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''کیا کہنے!'' اس نے کہا ''کوئی آج بہت خوش ہے۔ کیا ہوا؟ لاٹری نکل آئی؟''

میں منہ دھلانے، پاؤڈر اور کریم کا انتظار نہیں کر سکتا تھا......

''مجھے دنیا کی تمام لاٹریوں کی پرواہ نہیں۔'' میں اس کی دکان سے باہر نکلتے ہوئے چیخا۔

حجام نے آواز دی:

''حضور کو پیسے دینا یاد نہیں رہا!''

''اوہ! میں بادشاہ سلامت سے معافی کا خواستگار ہوں......'' میں نے غصے سے کہا۔

میں پنسار کے پیچھے والے شراب خانے میں گیا۔ میں خشک گوشت، اچار، کالے زیتون اور روٹی کا ٹکڑا کھانے کے لیے بیٹھ گیا...... اور تھوڑی سی وائین میں غوطہ لگانے کے لیے بھی۔ ''سب میرے کھاتے میں جناب پنسار۔'' ظاہر ہے......

میں نے ایک گلاس چڑھایا، پھر دوسرا۔ جیسے ہی میں خشک گوشت کھانے لگا تو جھجک کا شکار ہو گیا۔ اس طرح میرے منہ سے بو آئے گی جو اسے پریشان کر سکتی ہے۔ میں اسے پریشان نہیں کر سکتا۔ جو بھی وجہ ہو۔ فیکٹری کا وقت ختم ہونے کو تھا اور میں نے کھڑکی پر اس کے انتظار میں کھڑے ہو جانا تھا۔ وہ ہنستے ہوئے لپکے گی، میری طرف ایک نظر کرے گی، آگے نکل جائے گی، وہاں سامنے، ہنسے گی، میری طرف مڑ کر دیکھے گی، میں نے ککڑی کے اچار کے ٹکڑے کو منہ میں ڈال کر اپنے مضبوط دانتوں کے ساتھ چبانا شروع کر دیا۔ اپنی ٹیڑھی ناک اور باریک انگلیاں میرے ذہن نہ آئیں۔ کام شروع کرنے کے بعد سے میرا وزن بڑھنے لگا تھا۔ ان سب باتوں کو بھول جانا چاہیے...... میں بہت خوش تھا۔ مجھے اسی وقت احساس ہوا کہ وائین کا اثر کتنا لطیف ہو سکتا ہے۔ میرا اداس اندر کہاں ہے؟ نظر ہی نہیں آ رہا...... چھپا ہوا ہے کہیں۔ میں اپنے آپ کو بہت طاقت ور محسوس کر رہا تھا، اندر کو چہرہ دکھانے کی جرات نہیں تھی۔

کسی بھی لمحے وہ نکل آئے گی، ایک نظر دیکھے گی، ہنسے گی، مڑے گی، ایک نظر دیکھے گی، مڑے گی، ایک نظر دیکھے گی، ہنسے گی...... وقت چلتا رہے گا، چاند نکل آئے گا، میں ان کے علاقے میں چلا جاؤں گا، اس گلی میں، موریوں کی اس بدبو میں، اور اس کی کھڑکی کے نیچے، زندگی تابناک ہے!

مزدوروں کے ساتھ وہ بھی فیکٹری سے نکلی۔ حسب معمول، اس نے ایک نظر دیکھا، مسکرائی اور ایک مبہم سا اشارہ کیا جسے میں سمجھ گیا۔

گھنٹے آہستہ آہستہ گزرتے گئے۔ جیسے گھنٹہ گھر نے نو بجائے، میں بدبو سے پہچانے

جانے والی اس گلی میں داخل ہوا۔ اس کی کھڑکی پر اندھیرا تھا۔ میں نزدیک ہوا۔ اور وہاں کھڑکی میں، ایک سایہ بنی ہوئی، میری محبوبہ کھڑی تھی۔

''تم نے دیر کر دی۔'' اس نے نیچے کی طرف سرگوشی کی۔

''کس نے؟ میں نے؟''

''ہاں۔ تم نے!''

''ابھی تو صرف نو بجے ہیں۔ کیا یہ دیری ہے؟''

''شاید نہیں...... بحر حال...... اس عورت نے تمھیں کیا بتایا تھا؟''

''کون سی عورت؟''

''وہ پاگل بوڑھی۔ اس کا نام گلو ہے۔''

''جس کے ساتھ کونے میں بات ہوئی تھی......''

''ہاں...... وہی۔''

''کہ لڑکی کے لیے کئی آدمی آتے ہیں......'' اس نے کہا ''تم اسے چھوڑ دو۔ وہ تمھیں گولی مار دیں گے، وہ تمھیں جان سے مار دیں گے۔'' اس نے کہا

''اس نے بتایا کہ وہ لوگ اتنے امیر ہیں کہ مجھے سونے کے عوض تول کر خریں لیں گے۔''

''تو اس نے یہ کہا...... کیوں...... اور کیا؟''

''یہی کہ تمھارے لیے بہت آدمی آتے ہیں۔ کہ تمھارا باپ ایک ٹیڑھا آدمی ہے اور وہ میرے جیسے آدمی کو تمھارے ساتھ شادی نہیں کرنے دے گا۔''

''جب اس نے یہ سب تمھیں کہا تو......؟''

''میں نے اس کا یقین کر لیا۔ میں نے فرض کیا کہ تم جانتی تھیں کہ وہ......''

''نہیں، میرے علم میں کچھ نہیں تھا۔ چناں چہ اسی وجہ سے تمہاری دلچسپی ختم ہو گئی تھی؟''

''میں اور کیا سوچتا؟''

''سنو! میری آنکھیں سونے اور ہیروں سے نہیں چندھیائیں۔ میری بات غور سے

سنو! آج کے بعد میں ہر روز تمھیں اُس کھڑکی میں دیکھنا چاہتی ہوں، میرا انتظار کرتے ہوئے۔ میری خواہش ہے کہ تم وہاں ہوا کرو۔''

''واقعی۔''

''واقعی۔''

''وہ عورت کون ہے؟''

''غیر اہم سی۔ صرف ایک دوست...... لیکن اسے میری فکر رہتی ہے۔ میرے باپ کے شام کی نماز پر جانے کے بعد آیا کرو تا کہ ہم باتیں کر سکیں۔ ٹھیک؟''

''ٹھیک۔ لیکن مجھے کیسے پتا چلے گا کہ وہ کس وقت جا رہا ہے؟''

''میں اطلاع کرا دیا کروں گی۔''

''لکھ کر بھیج دینا......''

''مجھے پڑھنا اور لکھنا نہیں آتا......''

''پھر چھوٹی لڑکی کو بھیج دینا......''

''تم نے کھڑکی میں لازماً بیٹھنا ہے۔ جیسے میری طرف دیکھا کرتے ہو، ویسے ہی دیکھنا اور مسکرانا۔ دوسری لڑکیاں حسد کرتی ہیں۔ کرنے دو، کسبیاں...... ان کا یہی علاج ہے۔''

''ہم کسی دن تصویریں دیکھنے چلیں گے۔''

''تصویریں دیکھنے؟ دماغ چل گیا ہے؟''

''کیوں؟''

''یہ ناممکن ہے!''

ٹھیک ہے۔ لیکن کیوں؟''

''میرا باپ مجھے جان سے مار دے گا۔''

''تمھارا باپ کیا واقعی......''

''تمھاری ماں زندہ ہے؟ لوگوں نے تمھارے باپ کے متعلق بتایا ہے۔ وہ یہاں نہیں ہے۔ وہ جلاوطنی میں کیوں ہے؟''

"یہ ایک طویل داستان ہے۔"

"کس کے ساتھ رہ رہے ہو، اس کے ساتھ کیوں نہیں گئے؟"

"میں گیا تھا لیکن واپس آ گیا۔ اب دادی کے ساتھ یہاں رہ رہا ہوں۔"

"سنو! تم اس کھڑکی میں میرا ہر روز انتظار کیا کرو۔ ٹھیک؟ جب میں کہوں تو اپنی دادی کو مجھے مانگنے کے لیے بھیج دینا۔ ٹھیک!"

"......!"

"ٹھیک؟"

"ٹھیک۔"

"اب تم جاؤ۔ میرا باپ آنے والا ہو گا۔ یاد رکھنا، میں تمھیں کھڑکی میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ ٹھیک؟"

وہ ایک جھلملاتی ہوئی روشن رات تھی، شہر سویا ہوا تھا، راستے خاموش اور گرد آلود تھے۔

تھوڑے دنوں میں ہی ہماری بات پوری فیکٹری میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ پیشتر اس کے کہ میں حالت کا جائزہ لے سکتا، مجھے مار دیے جانے کی چار دھمکیاں مل چکی تھیں، ایک کے بعد ایک، وہ مجھے قتل کرنے والے تھے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ میں لڑکی کا پیچھا کرنا چھوڑ دوں اور یہ کہ دفتر لڑکیوں سے بھرا پڑا ہے ورنہ...... دستخط شدہ، "کالے کوے۔"

نیچے، خون ٹپکتے ہوئے خنجر کی تصویر، دھواں چھوڑتا ہوا پستول اور مکوں کی جوڑی۔ اس سب کے باوجود میں ہر سہ پہر کھڑکی میں بیٹھتا اور گاہے بگاہے چھوٹی لڑکی آ کر کہتی کہ "اس کی بہن" اس رات میرا انتظار کرے گی۔ مجھے اس کی گلی تک پہنچنے کے لیے متعدد ویران گلیوں میں سے گزرنا پڑتا۔ ایک گلی خالی پارک میں سے ہو کر جاتی تھی۔ مجھے کسی قسم کا خوف نہیں تھا، یہ ایک دلچسپ کھیل لگتا۔

"مجھے ڈر لگا رہتا ہے۔" ایک دن اس نے مجھے اعتماد میں لیا، "مجھے یہ ڈراؤنے خواب آتے رہتے ہیں۔ میں اتنی پریشان رہتی ہوں کہ وہ تمھیں مار دیں گے۔"

"پھر میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"یہ تم پر منحصر ہے۔ تمھیں اپنی دادی کو ادھر بھیجنا چاہیے......"

"......؟"

"اگر وہ نہیں آئی تو مجھے کھو دو گے۔"

"کیوں؟ کیا ہو رہا ہے؟"

"مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے باپ کو کہیں سے اڑتی اڑتی خبر ملی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں سیواس (ترکی کا ایک معروف شہر) میں اپنے چچا کے پاس رہوں۔ کل کسی نے ہماری کھڑکی پر پتھر مارے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اگر میرے باپ کو پتا چل گیا تو یقیناً......"

"چناں چہ مجھے اپنی دادی کو لانا پڑے گا۔ اگر تمھارا باپ نہ مانا تو......"

"کم از اسے مانگنے کے لیے تو لاؤ......"

کچھ دنوں بعد گلو فیکٹری پر آئی۔

"آج شام۔" اس نے کہا۔ "ہمارے گھر آؤ۔"

"تمھارے؟ میں نہیں جانتا کہ تم کہاں رہتی ہو؟"

"ہم لڑکی کے گھر سے دو دروازے ادھر ہیں۔ چلے آنا، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں دروازے میں انتظار کروں گی۔ زیادہ اہم یہ ہے کہ تم آؤ۔"

اس رات نو بجے میں عورت کے چلا گیا۔ وہ دروازے میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ ہم اندر چلے گئے اور لکڑی کی گلی ہوئی چار سیڑھیاں چڑھے۔ ہم ایک چھوٹے کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کی کھڑکیوں پر کاغذ لگا دیا گیا تھا۔ ایک آدمی نے جس کا بعد میں پتا چلا کہ اس کا خاوند اور تعمیراتی مزدور تھا، مجھے خوش آمدید کہتے ہوئے مصافحہ کیا اور سگریٹ پیش کیا۔ گلو نے ہمارے لیے کوفی بنائی۔

"اس دن۔" اس نے کہا۔ "میں تمھارا امتحان لے رہی تھی۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ بہت نوجوانوں کی خاصی تعداد اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ مشکل یہ آن پڑی ہے کہ اب معاملات ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔ کوئی اس کے باپ کو خط لکھتا رہا ہے اور وہ غصے سے بھرا بیٹھا ہے اور بیچاری لڑکی کو مارنے کو دوڑتا ہے۔ رات اس نے بیچاری کو بھاری چھڑی کے ساتھ دیر تک پیٹا۔ وہ زخموں سے

بھری ہوئی ہے۔لڑکی نے تمہارا نام نہیں بتایا لیکن اس نے جلد یا بدیر معلوم کر لینا ہے۔''

''اگر تم جلدی نہیں کرو گے۔''اس کے خاوند نے کہا''اور اپنے خاندان کو اس کا ہاتھ مانگنے کے لیے نہیں بھیجو گے تو اُسے اپنے چچا کے گھر رہنے کے لیے سیو اس بھیج دیا جائے گا یا وہ آدمی تم دونوں کو قتل کر دے گا۔تم جانتے ہی ہو......''

اور اس نے مجھے ایک کہانی سنائی:

جہاں سے وہ آئے تھے، وہاں ایک مسلم لڑکی عیسائی مرد کے ساتھ بھاگ گئی۔ عیسائیوں نے جشن منایا۔ مسلمان غصے کی وجہ سے آپے سے باہر تھے۔اس وقت لڑکی کا باپ پہاڑوں میں تھا۔جب اسے خبر ملی تو اس نے ان کے لیے جال بچھایا۔لڑکا اور لڑکی شادی کی رات جب اپنے کمرے میں گئے تو وہ کھڑکی تک پہنچ گیا، جیسے ہی انھوں نے ایک دوسرے کو چومنا شروع کیا تو اس نے دونوں کو ایک گولی سے اڑا دیا۔

میں گھبرایا ہوا اور پریشانی کے عالم میں گھر آیا۔دادی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں کہاں سے شروع کروں؟ اسے کیسے بتاؤں؟ میں جانتا تھا کہ وہ کہے گی......

''اس وقت تمھارے ذہن پر کیا سوار ہے؟''اس نے پوچھا۔''اپنے تمام جہاز سمندر میں ڈبو آئے؟''

''میں خوش نہیں ہوں۔''

''خوش نہ ہونے کی کیا وجہ ہے؟ تم بھوکے نہیں ہو، تم بے لباس نہیں ہو، خدا کا شکر ہے......ناخوش ہونے کی کیا وجہ ہے؟''

''پتا نہیں۔میں بے چین سا ہوں۔سمجھ نہیں آرہی......''

''تم پھر سے شراب پینے لگے ہو۔تم اس بے کار چیز کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟''

یہ اب یا کبھی نہیں ہونا تھا۔

''میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔تم جانتی ہو کہ میں کیوں پیتا ہوں؟''

اس نے مکاری سے میری طرف دیکھا۔

''نہیں۔تم ایسے کیوں پیتے ہو؟ مجھے بتاؤ۔میں سمجھ جاؤں گی!''

''میں اس لیے پیتا ہوں کہ میں اکیلا ہوں۔تمام دن کام کرتا ہوں اور تھک جاتا ہوں، شاموں کو اس اندھیرے کمرے میں بیٹھنا پڑتا ہے۔''

''تو......میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟''

میں ہنس پڑا، وہ بھی ہنسنے لگی۔

''بولو۔''اس نے کہا''تھوک ڈالو۔''

میں پھر ہنسنے لگا۔

''میرے بیٹے تمھیں بتانا ہوگا۔جب تک ہمیں الجھن کا پتا نہ چلے تو حل کیسے ڈھونڈیں گے؟''

میں پھر ہنسنے لگا اور آگے پیچھے ٹہلنا شروع کر دیا۔لگا کہ اس کی نظر نے مجھے جکڑ لیا ہے۔

''وہ کون ہے؟''آخر کار اس نے پوچھ ہی لیا۔''کیا اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہے، کم از کم؟''

میں مر بھی سکتا تھا۔

''دیکھو!''میں بات کرنے میں کامیاب ہوا۔''میں مڈل سکول تک تعلیم نہیں حاصل کر سکا۔تمھیں معلوم ہے کہ میں کسی اچھے عہدے تک نہیں جا سکتا۔جو لڑکی مجھے چاہیے......''

''تم اپنے آپ کو اتنا حقیر کیوں بناتے ہو؟ تم ہر طرح سے اچھے ہو۔مجھے معلوم ہے کہ تمھاری تنخواہ زیادہ نہیں لیکن پھر بھی......تم نے ابھی اپنی فوجی تربیت بھی حاصل نہیں کی۔اپنے والدین کا بھی سوچو، کیا وہ مان جائیں گے؟''

وہ صحیح کہہ رہی تھی لیکن

''وہ کون ہے؟ اس کا خاندان کہاں کا رہنے والا ہے؟ ان کا خاندانی پس منظر کیا ہے؟ میں یقیناً کسی آوارہ کے ساتھ......''

''وہ باعزت لوگ ہیں۔اور......''

''وہ کون ہے؟''

''جہاں میں کام کرتا ہوں وہ بھی وہیں کام کرتی ہے۔''

''دفتر میں؟''

''نہیں۔''

''تو پھر کہاں؟''

''فیکٹری میں......''

''کیا؟ ایک مزدور! میں نے کیا کیا کہ مجھے یہ صلہ ملے؟ لڑکے، پاگل ہو گئے ہو کیا؟ دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تمام آدمیوں کے بیچ، فیکٹری میں کام کرتے ہوئے؟ وہ درجنوں کو نمٹا چکی ہوگی۔ خدا ہم پر مہربانی کرے۔''

وہ اپنے آپ سے بڑبڑاتے ہوئے غصے میں اُٹھی، وضو کیا اور مغرب کی نماز کی تیاری میں لگ گئی۔

میں باہر گلی میں بھاگ گیا۔

(XIX)

دن نہیں گزر رہے تھے۔

میں جتنی بھی منت سماجت کرتا، دادی ٹس سے مس نہ ہوتی۔

''تمھیں شادی کے لیے پیسوں کی ضرورت ہو گی۔ تمھارے پیسے کہاں ہیں؟ جب تمھاری بیوی کسی چیز کی فرمائش کرے گی تو تم پوری نہیں کر سکو گے۔ تم ایک تلخ اور پریشانی کے مارے ہوئے آدمی بن جاؤ گے۔ تم نے ابھی لازمی فوجی ملازمت بھی نہیں کی۔ جب تم فوج میں چلے جاؤ گے تو تمھاری بیوی کہاں رہے گی؟ اور بھی زیادہ اہم، تمہارا باپ، ماں، بھائی اور بہنیں ہیں...... یہ انتہائی نامناسب ہوگا کہ وہ جن حالات میں زندگی گزار رہے ہیں اور تم آرام سے ہو......''

دادی بالکل درست تھی

محبوبہ بھی بالکل درست تھی۔

اور میں؟ کیا میں ہی غلط تھا؟

میں نے اپنے آپ کو ایک بڑی مشین کے دانتوں میں پھنسا ہوا پایا اور لگا کہ مجھے بے رحمی کے ساتھ ادھر ادھر دھکیلا جا رہا ہے۔ میں شراب کے نشے میں دھت ہوئے بغیر سو ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر کبھی میں تھوڑی مقدار میں پی کر سو جاتا تو میرا اندر جاگ جاتا اور میرے ساتھ ایک نا ختم ہونے والی بحث میں الجھ جاتا اور ایک بات دوسری تک جا پہنچتی اور اس کا نتیجہ کچھ اور نکلتا۔ میں اپنے باپ، ماں، بھائی اور بہنوں کی قربانی دے دوں یا محبوبہ کی؟ جب میں سو جاتا تو مجھے والد کے

خواب آتے:

''تم کیسے بیٹے ہو؟'' وہ کہہ رہے ہوتے۔ ''تمھیں شرم آنی چاہیے! ہم یہاں اتنی غربت میں ہیں اور تم یہ سب کچھ کر رہے ہو......'

میں سارے خاندان کو خواب میں دیکھتا۔ ان کے وزن کتنے کم ہو گئے ہیں، ان کی آنکھیں کس طرح اندر دھنس گئی تھیں، ان کی رنگت زرد اور راکھ سی تھی۔

''ہر کوئی تمھاری وجہ سے میرے متعلق باتیں کر رہا ہے۔ تم نے مجھے سب کے سامنے شرم سار کر دیا ہے۔ میرا اب کیا بنے گا؟''

ہاں، تمہارا اب کیا بنے گا؟ میرے باپ، میری ماں، میرے بھائی، میری بہنوں، میرا، تمھارا کیا بنے گا؟ ہمارا کیا بنے گا؟

ایک رات میں نے اسے خواب میں دیکھا۔

وہ ایک اندھیرے تہہ خانے کے فرش پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں باندھے ہوئے تھے۔ دور کونے میں چھوٹا سا بلب زرد روشنی دے رہا تھا۔ اس کا باپ غصے کے عالم میں بڑا سا چاقو تیز کر رہا تھا۔ میری محبوبہ میری منت کر رہی تھی......

میں چیخ مار کر جاگ گیا۔ میں پسینے میں نہایا ہوا تھا۔

''کیا بات ہے، بیٹا؟'' دادی نے پوچھا، ''تمھیں کیا پریشان کر رہا ہے؟ اپنی حالت تو دیکھو!''

''کچھ نہیں......''

''ڈراؤنے خواب؟''

''ہاں......''

''کیا ہوا تھا؟''

''پتا نہیں......''

''کیسے کہتے ہو کہ پتا نہیں؟ کسی وجہ سے تم زور سے چیخے ہو!'

''پتا نہیں......''

قتل کی دھمکیوں والے خط ملتے رہے، ہر ایک پچھلے سے زیادہ خوفناک!

(XX)

''اس کا باپ۔'' گلو نے کہا، ''اس نے بے چاری لڑکی کو پیٹ پیٹ کر جان سے مار دینا ہے۔ اگر تم نے کچھ نہ کیا تو وہ اسے اس کے چچا کے پاس سیوااس میں بھیج دے گا۔''

اس کا خاوند فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔

''تم اپنی دادی کو شادی کا پوچھنے کے لیے کیوں نہیں بھیجتے؟ کس بات کا انتظار کر رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

کیا میرے لیے اسے کارخانے کی کسی اور درجنوں آدمیوں کی استعمال کی ہوئی والی بات بتانا ممکن ہوگا؟ انھوں نے مجھے معاملے کو ختم کر کے ایک اچھے اختتام پر پہنچنے کے لیے بلایا تھا؛ یا یہ معاملا طے ہونا تھا یا اس پر اختتامیہ نقطہ ثبت کرنا تھا۔

میں ناامید تھا اس لیے میں نے جھوٹ بولا۔

''میں نے اپنے والد کو خط لکھا ہوا ہے۔ مجھے ان کے خط کا انتظار ہے۔ صرف اتنی سی بات ہے......''

''تم نے پیسے بھی مانگے؟''

''نہیں۔ دیکھو نا، ہمارا رقبہ ہے، چناں چہ میں نے مختار نامہ منگوایا ہوا ہے۔ وہ جیسے ہی ملتا ہے......''

''کیا ہے؟'' گلو کے خاوند نے پوچھا۔ ''تمھارا رقبہ ہے؟''

''ہمارے پاس......''

''کافی؟ کہاں پر؟ اچھی زمین ہے؟''

میں نے اسے جگہ اور تعداد بتائی۔ وہ جوش میں آ گیا۔

''واہ، واہ۔'' اس نے کہا ''سنا تم نے؟ تمھاری تو زمین کافی ہے؟ تم کاشتکاری کیوں نہیں کرتے؟''

میں نے تمام کہانی سنائی۔ وہ غور سے سنتا رہا۔

''نوجوان، سنو! اس نے کہا، ''تم ہم سب کو وہاں لے چلو، ہل کر کاشت کریں گے۔ میں ہوں، میری بیوی ہے تم ہو تمھاری لڑکی ہے، تمھاری لڑکی کا بھائی ہے اور اس کا باپ......''

اس نے بتایا کہ ہم کس طرح سے ایک خوب صورت فارم بنائیں گے۔ ہمارے پاس گایاں، مرغ، بھیڑیں اور بکریاں ہوں گی، ہم کافی مقدار میں انڈے اور دودھ حاصل کر سکیں گے۔ زمین کا کچھ حصہ پھل اور سبزیاں اگانے کے کام آ سکے گا۔ وقت گزرنے کے ساتھ گایوں، مرغیوں اور بھیڑوں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے گا، ہم مکھن، دودھ اور انڈے بیچنا شروع کر دیں گے۔ آہستہ آہستہ کاروبار بڑھتا رہے گا......

''جلدی سے خط منگوالو'' گلو کے خاوند نے کہا۔ ''اور میں ایک پائی تک نہیں مانگوں گا۔ ہم وہاں جا کر اپنے ہاتھوں سے باڑا تعمیر کریں گے۔ میں پانچ یا چھ مرغیاں، ایک میٹھا، لیموں اور مالٹے کے پودے، کچھ سبزیاں لے کر آؤں گا اور ہم ٹھیک ٹھاک ہو جائیں گے۔ میں اینٹیں بناتے بناتے تنگ آ گیا ہوں۔''

گلو بھی اس کی طرح ہی مشتاق تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ایسی ترکیبیں سامنے لا رہے تھے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تمام گفتگو غیر حقیقی تھی، مجھے لگا کہ میں بھی ان کے جوش کا حصہ بنتا جا رہا ہوں۔ اس نے یقین کر لیا کہ والد کو خط لکھ کر مختار نامہ منگواؤں گا۔

انھوں نے سوچ لیا کہ معاملہ طے ہو چکا ہے۔ گلو اتنا خوش تھی کہ وہ رضائی نگندنے والی سوئی لیے میرے پاس آئی۔

''نوجوان۔'' اس نے کہا۔ ''تم تیار ہو؟''

''کیا مطلب؟''

''میرے خون کے بھائی بنو گے؟''

''ہاں، کیوں نہیں؟'' میرے منہ سے نکلا۔

اس کے خاوند نے مداخلت کی۔

''ہم ایسا ایک جشن منانے سے پہلے نہیں کر سکتے...... میں جا کر کچھ برانڈی اور لیمونیڈ لاتا ہوں۔ پھر ہم جام لیں گے اور اس کے بعد......''

گلو نے خوشی کے مارے اپنے خاوند کی گردن کو بازوؤں میں لے لیا۔

''یہ زبردست ہوگا!'' اس نے خاوند کو چومتے ہوئے کہا۔ ''میں اتنی خوش ہوں۔ ٹھہرو۔'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا، ''مجھے ایک خیال آیا ہے۔ کیا میں لڑکی کو بھی لے آؤں؟''

''اپنے آپ کو قابو میں رکھنا'' اس کے خاوند نے لقمہ دیا۔ ''تمام معاملات کا ستیاناس نہ کر دینا۔''

گلو پہلے ہی دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ جب اس کا خاوند برانڈی اور لیمونیڈ لینے گیا تو میں کمرے میں اکیلا رہ گیا تھا۔ میں نے ان کی کھڑکی میں سے رات کے آسمان کو دیکھا۔ دور فاصلے پر سرخ چاند آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا تھا، فیکٹری سے سرگوشی سی اٹھ رہی تھی، اور تمام علاقے کے لیے دھیرے سے چلتی ہوئی مشین کی دھمک دل کی دھڑکن کا کام دے رہی تھی۔

میں بے آرام اور دل گرفتہ محسوس کر رہا تھا۔ میں کوئی نشان دہی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود کہ میری محبوبہ ایک آدھ منٹ بعد آ جائے گی، شاید ہم ساتھ ساتھ بیٹھیں اور ممکن ہے ایک دوسرے کو مسکراتے ہوئے دیکھیں۔ اچانک میری نظر برتنوں والی الماری پر پڑی، اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اس کے اندر دیکھا۔ وہ کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ میں حیران ہوا۔ وہ یقیناً گلو یا اس کے خاوند کی ملکیت نہیں تھیں۔ میں سوچنے لگا کہ وہ کتابیں کس کی ہو سکتی ہیں۔؟ مجھے تجسس تھا کہ وہ کس کی ہیں اور ان کے موضوعات کیا ہیں۔ انہیں وہاں کس نے رکھا؟ میں ابھی ایک کتاب نکالنے ہی والا تھا کہ باہر والا دروازہ کھلا اور زور سے بند ہوا۔ میں الماری سے پرے ہٹ

گیا۔

گلو تھی اور اسی جلدی میں واپس آئی جس میں وہ گئی تھی۔

''مجھے اجازت مل گئی ہے۔'' اس نے کہا'' چناں چہ وہ ایک منٹ میں آتی ہو گی۔ تم آرام کے ساتھ بیٹھنا! مجھے کوئی گڑبڑ نہیں چاہیے۔ میں نے اس کے باپ کے ساتھ جھوٹ بولا اور وہ مان گیا۔ میں نے کہا کہ ہم بیتو کے ہاں شربت کا ایک گلاس پینے جا رہے ہیں۔ میری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو اس نے انکار کر دینا تھا۔ میرے لئے...... وہ سب کچھ کر دے گا۔ مجھے وہ اپنی بیٹی کی طرح چاہتا ہے۔ کاش میرا بھائی یہاں ہوتا۔ وہ...... وہ جان دے دیتا۔ وہ اگر یہاں ہوتا......''

''تمہارا بھائی؟'' میں نے پوچھا۔'' وہ کیا کرتا ہے؟''

''وہ اب یہاں نہیں، بہت ہوشیار ہے۔ میرا بھائی۔ وہ ان الفاظ کو جانتا ہے۔ سارا دن اس کی باتیں سنی جا سکتی تھیں۔''

اس نے کتابوں والی الماری کا دروازہ کھولا۔

''یہ کتابیں دیکھتے ہو؟ یہ اس کی ہیں۔ وہ ہر رات پڑھتا......''

میرا تجسس متحرک تھا۔

''وہ اب کہاں ہے؟''

''وہ اب یہاں نہیں ہے۔ وہ چلا گیا ہے۔''

''کہاں چلا گیا ہے؟''

''میں نہیں جانتی۔ بس وہ چلا گیا...... وہ کپڑے کے کارخانے میں کام کرتا تھا۔ وہ ماسٹر بننے والا تھا۔''

میرا چہرہ اتر گیا۔

''عزت، ماسٹر عزت سب کہتے تھے اسے۔ ٹھہرو، کہیں اس کی تصویر ہے......'' وہ ساتھ والے کمرے سے اپنے بھائی کی تصویر لے آئی۔ ہاں، یہ وہی تھا۔ نیلی ڈانگری والا میرا دوست۔

''سنو! میں اسے جانتا ہوں۔'' میں نے حیرت کے ساتھ کہا،'' وہ میرا دوست ہے۔''

گلو اچانک سنجیدہ ہو گئی۔ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔

''ہوں! تم اسے جانتے ہو۔ تمھارے پاس بھی کتابیں ہیں؟''

''ہاں......''

''بہت ساری؟''

''بہت ساری؟''

'چند ایک۔''

اس نے اپنا سر ہلایا۔

''سو، وہ تمہارا دوست ہے؟ اگر وہ تمھا دوست ہے تو تم کیوں پوچھ رہے ہو کہ وہ کہاں ہے؟''

اس کا خاوند برانڈی اور لیمونیڈ لے کر آ گیا۔

''سنو۔'' اس نے اسے مخاطب کیا۔'' دنیا کتنی چھوٹی ہے۔ یہ میرے بھائی کو جانتا ہے۔ یہ اس کا دوست ہے۔''

اس نے اپنے خاوند سے بوتلیں لے لیں۔

''واقعی؟'' اس نے کہا،'' وہ تمہارا دوست ہے؟''

دونوں نے نظروں کا تبادلہ کیا، تھوڑا سا ہنسے، ایک دوسرے کو آنکھ ماری۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔'' حیران ہونے کی کیا بات ہے؟ ہنسنے کی کون سی بات ہے؟ تم دونوں ایک دوسرے کو آنکھ کیوں مار رہے تھے؟ میں کوئی عجیب سی مخلوق ہوں، میں نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ میں اسے جانتا ہوں!''

''نہیں۔'' گلو نے کہا'' بالکل ایسے نہیں۔''

میں نے اس کے متعلق ڈھیروں سوال پوچھے۔ میں اس کے متعلق کچھ جاننا چاہتا تھا۔ بس ناکام ہو گیا۔ وہ موضوع کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ مجھے لگا کہ وہ کچھ چھپا رہے تھے۔

''عزت کے بیوی بچے ہیں؟''

'' تھے۔'' گلو نے کہا'' اس کی بیوی تھی۔ ہمارے ساتھ کارخانے میں کام کرتی تھی۔ اس کا ایک بازو مشین میں پھنسنے کی وجہ سے کٹ گیا اور خون زیادہ نکل جانے کی وجہ سے اس کی

موت واقع ہوگئی۔"

"فوت ہوگئی؟"

"فوت ہوگئی۔"

"اور بچے؟"

"ایک تھا۔ وہ ریل گاڑی کے نیچے آ گیا۔"

"کیا؟"

"وہ ریل گاڑی کے نیچے آ گیا۔"

"بیڑا غرق! کیسے ہوا! بچے کی عمر کتنی تھی؟"

"صرف چھ برس۔ خوب صورت چھوٹا سا لڑکا، گھنے گھنگھریالے بال، مضبوط بچہ۔ بہت ذہین......"

"لیکن یہ کیسے ہوا؟ وہ ریل گاڑی کے نیچے کیسے آیا؟"

"اس کی ماں کو کام کرنا پڑتا، باپ اس وقت جیل میں تھا۔"

"جیل میں؟ کیوں؟"

"دلچسپ واقعہ نہیں۔" گلو کے خاوند نے کہا، "مرغیوں کی چوری، کچھ ایسے ہی!"

"گاڑی جا رہی تھی۔" گلو نے بات جاری رکھی۔ "وہ ریل کی پٹڑیوں پر کھیل رہا تھا۔ ننھی جان گر گئی اور اس کا پاؤں اٹک گیا۔ وہ وہاں سے نکل نہیں سکا۔ دو ٹکڑوں میں کٹ گیا۔ میں ذہنی مریض نہیں بننا چاہتی لیکن یہاں سے...... اس طرح۔ وہ اسے دو حصوں میں لائے۔"

مجھے عزت کا عکس اپنی طرف دیکھتے ہوئے نظر آیا۔

"یہ علاقہ۔" "اس نے مجھے کہا" میں ان الفاظ میں کہوں گا جو تم بھی استعمال کرو گے، ان لوگوں کا علاقہ ہے جنھیں خدا نے بھلا دیا ہے، یہاں اور بہت سارے لوگ ہیں جنھیں شکایت کا تم سے زیادہ حق ہے!"

"تم نے کبھی کٹا ہوا بازو دیکھا ہے؟" گلو کے خاوند نے پوچھا۔ "وہ ہلتا رہتا ہے، ہلتا رہتا ہے، ایسے۔ انگلیاں کھلتی اور بند ہوتی رہتی ہیں اور یہ جامنی ہو جاتا ہے......"

"میں نے دیکھا ہے۔" گلو نے کہا، "سلیمان نامی ایک آدمی تھا۔ وہ روئی دھنا کرتا تھا۔ وہ عرب تھا۔ اس کے بال کالے اور گھنے تھے۔ بات اس کی بیوی کی ہے۔ وہ میرے پاس ہی تھی اس کا بازو کٹ گیا۔ میں سکتے میں آ گئی۔ میں نے بازو کو اٹھا لیا۔ وہ گرم تھا اور اس میں سے خون ٹپک رہا تھا......"

ایک دم میری طبیعت خراب ہوگئی۔ میرے ذہن میں کٹی ہوئی انگلیاں اور بازو آ گیا، وہ میری طرف ہل رہا تھا۔ میں نسوں میں سے بہتے ہوئے خون کی آواز سن سکتا تھا۔

پھر میری محبوبہ آ گئی۔ وہ ناراض لگ رہی تھی۔

"مجھے ڈاک کے ذریعے مختار نامہ پہنچنے کا انتظار ہے۔" میں نے اسے بتایا۔

"کیوں؟ اس کا کیا فائدہ ہے؟ تم نے اسے کہا کہ تمھیں پیسے دے؟"

"میں نے مختار نامہ مانگا ہے۔" میں نے دہرایا۔ "مختار نامہ۔"

اس نے کندھے اچکائے۔

"اس کا کیا فائدہ ہوگا؟"

میں نے اسے فارم کی تفصیل بتائی جو ہم گلو کے ساتھ مل کر چلانے والے تھے۔ گلو اور اس کے خاوند نے میری تائید کی۔ مجھے اپنی محبوبہ اس بات کا یقین کرتے ہوئے لگی۔

"بس، حالات خراب ہوئے سے پہلے سب کچھ ہو جائے۔" میری محبوبہ نے کہا۔

اور اس نے تفصیل بتائی: باپ اس پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ کام پر سے آتے اور جاتے ہوئے لوگ اسے روک رہے تھے، اسے چاقو دکھا رہے تھے۔ اسے قتل کی دھمکیاں مل رہی تھیں اور ان کی کھڑکی پر رات کے وقت پتھر پھینکے جا رہے تھے۔

گلو نے اسے برانڈی اور لیمونیڈ کا گلاس تھمایا۔

"چلو لڑکی!" اس نے کہا۔ "اسے پیو، ایک ہی ڈیک میں۔ گلاس میں کچھ نہ بچے ورنہ......!"

میری محبوبہ گلاس ختم کر گئی۔

پھر میں نے پیا۔ پھر گلو اور اس کے خاوند نے پیا۔ پھر یہ چلتا رہا۔ گلاس بھرے جا رہے

تھے اور خالی ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم نشے میں آ گئے۔ گلو رضائی والی سوئی لے آئی۔

''دیکھو۔'' اس نے کہا، ''میں پہلے اپنے سوئی چبھوؤں گی، پھر تمھاری باری ہو گی۔ تیار؟''

اس نے سوئی چبھوئی، انگلی کے کنارے پر خون کا قطرہ ہل رہا تھا۔ اس نے انگلی میری طرف بڑھائی۔ میں نے خون چوس لیا۔ پھر میں نے اپنی انگلی میں سوئی چبھوئی جسے اس نے چوسا۔ اب سرکاری طور پر میں اس کا خون بھائی تھا۔

گلو کا خاوند اب نشے میں دھت تھا۔ جشن منانے کے لیے وہ اپنا باجا اٹھا لایا۔ میرے خیال میں ماسٹر عزت کے بیٹے کے فوت ہونے کے بعد سے باجا الماری میں ہی رکھا رہا تھا۔ اس غارت گردن کے بعد وہ آج میری شان میں اسے بجانے لگا تھا۔

اس رات ہم نے باجا بجایا، گانے گائے اور قہقہے لگائے۔ گلو نے بوسنیا کے عوامی گیت گائے اور اس کے خاوند اور اس نے ہمارے لیے ناچ ناچے۔

میری محبوبہ نے اپنا سر میرے کاندھے پر رکھ دیا۔ میں نے اپنا بازو اس کی کمر کے گرد ڈال دیا، اس کی کمر متحرک تھی۔ میں نے زیادہ زور سے چٹکی کاٹ دی ہو گی کیوں کہ اس نے قدرے اونچی آواز میں ''اوئی'' کہا اور ساتھ ہی گلو اور اس کے خاوند کی طرف دیکھا۔

''بدتمیزی مت کرو۔'' اس نے کہا۔ ''یہاں اور لوگ بھی ہیں۔''

گلو نے لازماً کچھ دیکھ لیا ہو گا کیوں کہ اس نے جلدی سے لیمپ بجھا دیا۔ اچانک ہونے والے اندھیرے کی جگہ آہستہ آہستہ چاند کی چاندی جیسی روشنی لینے لگی۔ یہ روشنی کھڑکی میں سے بہتے ہوئے آ رہی تھی۔ یہ گلو کی لکڑی کی الماری پر سے چمکتے ہوئے پھیل رہی تھی۔

گلو اور اس کے خاوند نے ایک نیا عوامی رقص شروع کر دیا تھا۔ یہ زیادہ تیز اور جاندار تھا۔ وہ تیز تیز گھومتے ہوئے طاقت سے بھرپور حرکت کر رہے تھے۔

میں نے اپنی محبوبہ کو پکڑ کر تمام طاقت کے ساتھ چمٹا لیا۔

اچانک گلی والا دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا جانے لگا۔ میری محبوبہ کھسک گئی، میرے بازوؤں میں سے تیرتے ہوئے نکل کر۔ وہ خوف زدہ تھی۔ وہ میرے پیروں کے پاس ہی جم کر بیٹھ

گئی، نہ اس میں اٹھنے کی سکت تھی نہ ہلنے کی۔

''میرا باپ ہے۔'' اس نے کہا، ''وہ میرا باپ ہے۔ اس نے سن لیا ہو گا کہ میں شربت پینے نہیں گئی۔ او خدا! میں کیا کر بیٹھی! اب میں کیا کروں؟''

گلو نے جلدی سے لیمپ جلایا اور اس کے خاوند نے بوتلیں چھپا دیں۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے کہا، ''اگر وہ تمہارا باپ ہے تو تمہارا باپ ہے۔ پھر کیا ہوا؟ وہ کیا کرے گا؟''

وہ دروازے کی طرف گیا۔

میں نے اپنی محبوبہ کے ہاتھ تھام لیے۔ وہ یخ تھے۔

''ہم کیا کریں گے؟'' وہ بار بار کہے جا رہی تھی۔ ''ہم کیا کریں گے؟ وہ مجھے ابھی جان سے مار دے گا۔''

اچانک ہم نے بلند آواز میں بوسنیائی لب و لہجے میں شور، قہقہے اور نعرے سنے۔

''یہ میرا بھائی ہے۔'' گلو نے کہا، ''وہی ہے۔''

وہ چھلانگ لگا کر باہر کی طرف نکل گئی۔

باہر واقعی اس کا بھائی تھا۔ وہ تھکا تھکا سا لڑکھڑاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے مجھے دیکھا۔

''واہ، واہ! دیکھو تو یہاں کون ہے؟ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

ہم نے مصافحہ کیا۔ گلو اور اس کے خاوند نے میرے وہاں ہونے کی تفصیلی وجہ بتائی۔

ماسٹر عزت نے تمام بات سنجیدگی کے ساتھ سنی۔ اس نے سوال نہیں پوچھے۔

''بہن۔'' اس نے کہا، ''میرے لیے پانی کا برتن گرم کرو گی؟''

گلو فوراً اٹھ کر پانی گرم کرنے چلی گئی۔ ماسٹر عزت سگریٹ کا کش لیتے ہوئے خاموش بیٹھا رہا۔

''تمھیں مجھے معاف کرنا پڑے گا۔'' اس نے کہا۔ ''میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ کل باتیں ہوں گی۔ میں کچھ عرصہ یہاں رہوں گا۔''

وہ اٹھ کر چلا گیا۔

"تم اسے کیسے جانتے ہو؟" میری محبوبہ نے پوچھا۔ "وہ میرے باپ کا بہت قریبی دوست ہے۔ لیکن تم اسے کیسے جانتے ہو؟"

میں نے اسے بتایا۔

"یہ اچھی بات ہے" اس نے کہا، "تم اسے ہمارے متعلق قائل کرو۔ وہ میرے باپ کا دنیا میں سب سے اچھا دوست ہے۔"

گلو کے خاوند نے باجا الماری میں رکھ دیا۔ وہ سگریٹ پی رہا تھا۔ پھر وہ بھی چلا گیا اور ہم دونوں رہ گئے۔ میں نے اپنی محبوبہ کو بازوؤں میں لے لیا لیکن اس مرتبہ وہ دائرے سے باہر نکل گئی۔ اس کا سفید سرپوش پھسل کر گردن پر آ گیا تھا اور وہ بری طرح سے شرما رہی تھی۔

"بند کرو۔" اس نے کہا، "مہربانی کرو۔ ختم کرو۔ میں نے کچھ پوچھنا ہے۔"

میں نے چھوڑ دیا۔

"پوچھو!" میں نے کہا۔

"تم نے سچ جواب دینے ہیں۔"

"دوں گا۔"

"مر جاؤں اگر نہ بتاؤں؟"

"مر جاؤں اگر نہ بتاؤں۔"

"تم نے اپنے خاندان والوں کو کیوں نہیں بھیجا؟"

اس نے دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"بھجواؤں گا۔" میں نے کہا۔

"اس رات۔" اس نے کہا۔ "تم نے کہا تھا کہ تم اپنی دادی کو بھیجو گے۔ پھر کیا ہوا؟"

'میں نے بتایا نا کہ میں نے والد کو خط لکھا ہوا ہے......"

"تم نے والد کو خط لکھنے کے متعلق پہلے تو نہیں بتایا تھا۔ تم نے کہا تھا کہ دادی سے بات کرو گے اور اسے یہاں آنے اور مجھے مانگنے کے لیے کہو گے۔ وہ کیوں نہیں آئی؟"

"......؟"

"جواب کیوں نہیں دے رہے ہو؟ کیا تم نے پوچھا اور وہ نہیں آئی؟ کیا اس نے کہا، 'میں کارخانے میں کام کرنے والی لڑکی کو اپنے پوتے کے لیے کیوں مانگوں۔'"

مجھے لگا کہ میرے سر پر گرم پانی انڈیل دیا گیا ہے۔

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔"

"نہیں! بالکل ایسی ہی بات ہے۔ میں ایسے لوگوں کو جانتی ہوں۔ وہ کارخانہ میں مزدوری کرتی لڑکی کے لیے اتنا نہیں جھکیں گے۔ وہ کہیں گے، 'اس نے ہزاروں اور ہزاروں مردوں کے ساتھ ہم بستری کی ہوگی۔' اور اپنے آپ کو جھکانے پر رضامند نہیں ہوتے۔"

میں نے اسے خاموش کرانے کی کوشش کی۔

"مجھے خاموش مت کراؤ" اس نے کہا، "مجھے بات کرنے دو۔ میں جانتی ہوں کہ وہ لوگ کیسے ہیں۔ تمہاری دادی نے آ کر مجھے مانگنے سے انکار کر دیا اس لیے تم نے...... دیکھو، تمھیں میرے ساتھ ایماندار ہونا پڑے گا۔ تمھیں مجھ سے کچھ چھپانا نہیں چاہیے۔ اس کے علاوہ تمھارے لیے پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ یہ سچ ہے۔ اس نے یہی کہا تھا نا؟"

میری حالت غیر تھی۔

"میں تم سے بات کر رہی ہوں۔" اس نے کہا "جواب دو! یہ ایسے ہی ہے، ہے کہ نہیں؟ وہ کارخانہ میں مزدور لڑکی ہے اور ہمارے خاندان کے لیے مناسب نہیں۔ وہ ہزاروں آدمیوں کے ساتھ لگی ہوگی۔ اس نے یہی کہا ہوگا۔ میرے ساتھ بات کرو!"

اچانک اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میری طرف دیکھو!...... انھیں بھول جاؤ۔ میرے ساتھ محبت کرتے ہو یا نہیں؟"

"بہت زیادہ......"

"پھر اپنے باپ کے پیسوں کا انتظار مت کرو......"

"یہ پیسے نہیں، مختار نامہ ہے......"

"جو بھی ہے...... کچھ نہ مانگو۔ تم میرے باپ کے ساتھ بات کرو۔ تم کسی شام کو آ سکتے

ہواور مجھے مانگ سکتے ہو۔......میرا باپ سخت مزاج آدمی ہے اور اسے بہادری اور ایمانداری پسند ہے۔اس لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے گھر آؤ اور اسے بتاؤ......''

''اگر اس نے مجھے بھگا دیا تو......''

''وہ نہیں بھگائے گا۔ان باتوں کی پروا مت کرو جو لوگ اس کے متعلق کرتے ہیں۔وہ برا آدمی نہیں ہے۔اسے براہ راست بات چیت پسند ہے۔دوسرے لوگوں کے کہے کو بھول جاؤ۔''

''اگر اس نے انکار کر دیا؟''

''تم بات ضرور کرو۔اگر وہ انکار کرتا ہے تو بعد میں سوچیں گے۔میرے بھائی نے ہمارے متعلق سن لیا ہے۔وہ تمھیں فٹ بال کھیلنے کی وجہ سے جانتا ہے اور تمھاری کافی تعریف کرتا ہے۔اس نے میرے باپ کے ساتھ تمھارے حوالے سے اچھی باتیں کی ہیں۔اس لیے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔تم آؤ اور مجھے مانگو۔مجھے پکا یقین ہے کہ وہ ہاں کہے گا۔میرا باپ ایماندار آدمی ہے اور اسے ایمان داری پسند ہے۔''

پھر وہ طویل بیان میں چلی گئی۔ہمیں پیسے کی ضرورت نہیں تھی۔وہ مجھ سے جوتوں یا کپڑوں یا کسی اور چیز کی مانگ نہیں کرے گی۔جہاں تک میری تنخواہ ہے، وہ ہم دونوں کے لیے کافی نہیں ہوگی۔اس لیے وہ بھی کام کرے گی۔ہم ان کے صحن میں ایک کمرہ کرائے پر لے کر رہ سکتے ہیں۔اگر دو دل مل جائیں تو اور کیا اہم ہے؟

''میں کچھ پوچھنا چاہوں گی۔'' اس نے کہا، ''مجھ سے پہلے کسی کے ساتھ تمھیں محبت ہوئی تھی؟ دوسری عورتوں کے ساتھ تمھارا تعلق رہا ہے؟''

''نہیں، کبھی نہیں۔''

''سچ بتاؤ......''

''میں سچ بتا رہا ہوں۔''

''مجھے تمھاری بات پر یقین نہیں۔تمھارا عورتوں کے ساتھ ضرور تعلق رہا ہوگا!''

مجبوراً میں نے یونانی لڑکی ہیلینا کے متعلق بتایا۔وہ غور سے سنتی رہی۔

''وہ مجھ سے زیادہ خوب صورت رہی ہوگی۔'' اس نے کہا، ''ایمان داری سے بتاؤ۔

میرا مطلب ہے کہ جو ہو گیا سو ہو گیا۔انسان جب کم عمر ہو تو بہت کچھ ہو جاتا ہے۔لیکن اب......''

''اب ویسا کچھ نہیں ہوگا۔''

''بہتر بھی یہی ہے کہ نہ ہو!''

''تم کیا کرو گے؟''

''میں کیا کروں گا؟ تمھیں پتا چل جائے گا......''

پھر اس نے والد اور میرے خاندان کے متعلق پوچھا۔

وہ وہاں کیوں گئے؟ ان کا وہاں کون خیال کرتا ہے؟ وہ واپس کیوں نہیں آ جاتے؟ اگر وہ آنا چاہیں تو آ نہیں سکتے؟

میں نے ان کے متعلق مختصراً بتایا اور یہ کہ میرا بھائی نیازی اب ان کا خیال رکھتا ہے۔

''وہ تم سے چھوٹا ہے؟''

''ہاں، تقریباً پانچ سال۔''

''پانچ سال؟ اس کے لیے اچھا ہی ہے۔کیا کرتا ہے؟''

''گلیوں میں سامان بیچتا ہے۔ایمان داری کی بات ہے کہ اسے جو بھی کام مل جائے، کر لیتا ہے۔''

''تو وہ، ہماری طرح ہی ہے؟ اگر میں تمھاری جگہ ہوتی تو ماں اور باپ کو ایسے چھوڑ کر نہ آتی۔''

میں تب اپنی منطق بیان کرنے کا طریقہ نہ نکال سکا۔میں خاموش رہا۔

'میں کشیدہ کاری کر سکتی ہوں، بہت مہارت کے ساتھ اور میں بُن بھی سکتی ہوں۔ میں تم پر کبھی بوجھ نہیں بنوں گی۔ہمت کرو۔ہمارے گھر آ کر مجھے مانگ لو۔میرا باپ کاٹ نہیں کھائے گا!''

میں جب اٹھا تو کافی دیر ہو گئی تھی۔میں خوش اور پرسکون تھا، جیسے مجھے وہ سب کچھ مل گیا ہو جس کی ایک آدمی کو خواہش ہوتی ہے۔گلیاں سنسان تھیں۔لوگوں کے گھروں میں بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔دکانوں کے شٹر بند تھے۔

میں نے بہت کوشش کی کہ دادی کی جاگ نہ کھلے۔ فرش کے پھٹے سے آواز آئی اور دادی کوندے کی طرح اٹھ بیٹھی۔ اس نے پوچھا کہ میں کہاں تھا۔ میں نے اسے بتا دیا۔

''احمق لڑکے۔'' اس نے کہا، ''احمق لڑکے...... ہزار آدمیوں کے درمیان میں پالی گئی لڑکی، تم بعد میں پچھتاؤ گے، لیکن......''

میں دیر تک اس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔

''نہیں، نہیں......'' اس نے کہا۔ ''میرا اس معاملے کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں۔ اگر خدا نے ایسے ہونے دیا تو یہ اس کا کرنا ہوگا۔ میں کچھ جاننا نہیں چاہتی۔''

اس نے لحاف سر کے اوپر لے لیا۔

میں سو گیا۔ کئی ہفتوں کے بعد میں گہری نیند سویا۔ اس رات مجھے مالٹوں کے روشن جھنڈ جو چمکتے ہوئے سنہری پرندوں سے بھرے ہوئے تھے اور چاندی سی ندی وہاں سے بہتی ہوئی، خواب میں نظر آتی۔

(XXI)

''تمھاری دادی بالکل درست ہے۔'' ماسٹر عزت نے کہا۔

میں نے فوراً اعتراض کیا۔

''کیا؟ وہ درست ہے؟ تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''ہاں، وہ درست ہے،'' اس نے میری بات کاٹی۔ ''پہلی بات کہ تمھارے پاس شادی کرنے کے لیے پیسے نہیں، دوسری بات کہ تم کماتے بہت کم ہو اور تیسری، جو سب سے اہم بات ہے......؟

''وہ کیا ہے؟''

''اردگرد کے لوگ جو سوچیں گے اسے قبول کرنا ہوگا۔ جہاں تک ان کا تعلق ہے، کارخانے میں کام کرنے والی لڑکی ایمان دار سلجھی ہوئی نہیں ہو سکتی۔''

''لیکن......''

''میں کہتا ہوں، وہ یہ کہتے ہیں اور تمھیں ماننا ہوگا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ درست ہیں۔ میں صرف ان کا نقطۂ نظر بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ یہی سوچیں گے اور ایسے خیالات ان کے سنگِ راہ ہیں۔ وہ اس بات سے بھی لاعلم ہوں گے کہ ایسے رویے ان کے سنگِ راہ ہیں۔ جلد یا بدیر تم اس بے چاری لڑکی کے ساتھ ان کے ماحول میں آ جاؤ گے۔ وہ سب اس لڑکی کو نفرت سے دیکھیں گے جیسے وہ دوسرے مردوں کے ساتھ ہم بستری کرتی رہی ہو۔ وہ اس کی پیٹھ

کے پیچھے باتیں کریں گے اور رسوا کرنے والی رائے دیں گے۔ یہ تمھارے اور اس کے لیے پریشانی کا باعث ہوگا۔ وقت گزرنے کے ساتھ وہ اپنا دل لگا لے گی اور ان کو نقل کرنا شروع کر دے گی۔ وہ ان جیسے لباس پہنے گی، ان جیسی باتیں کرے گی اور ان کی طرح سوچنا شروع کر دے گی۔ ایک دن وہ کارخانے میں کام کرنے اور ماضی کی اپنی غربت پر شرمسار ہو جائے گی اور تمام زندگی ناآسودہ رہے گی۔''

اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔

''میں ایسے نہیں ہونے دوں گا!'' میں نے کہا۔

''میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' اس نے کہا'' یہ واضح ہے کہ تم نے ذہن بنالیا ہے اور اسے بدلو گے نہیں۔ اس گفتگو کو ختم کریں۔ غور کرو......''

اس نے میری محبوبہ کے متعلق سب کچھ بتایا۔

''وہ ایک اچھی لڑکی ہے، بہت ذمے دار بیٹی ہے، وہ کارخانے میں بارہ گھنٹے کام کرتی ہے اور گھر آ کر فرش صاف کرتی ہے، کپڑے دھوتی ہے، پھٹے ہوئے کپڑے سیتی ہے، موزے مرمت کرتی ہے...... وہ ایک مضبوط لڑکی ہے۔ وہ اکیلے ہی تمھارا گھر چلاتی رہے گی۔ اس کے باوجود ایک دن آئے گا کہ تم اس کے ساتھ شادی کر کے پچھتاؤ گے۔ میں دہراتا ہوں: تمھاری طبیعت میں تجسس ہے، تم ایک ذہین آدمی ہو۔ ایک دن تم اپنے کیے کے نتائج کو محسوس کرو گے اور پچھتاؤ گے۔ میں نہیں جانتا......''

ہم نے اتنی ہی باتیں کیں۔ میرا خیال ہے کہ تین دنوں کے بعد وہ اسی طرح چلا گیا جس طرح آیا تھا۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں کہ وہ کیوں اور کہاں گیا۔ جانے سے پہلے وہ ایک مہربانی کر گیا۔ اس نے میرے متوقع سسر سے میرے اور خصوصی طور پر میرے والد کے متعلق بات کی۔ والد کا نام سن کر بزرگ مسکرایا۔ اس کی والد کے ساتھ ''پرانے'' دنوں سے شناسائی تھی۔

''اس کے بیٹے کو میں پانچ بیٹیاں دے دوں۔'' اس نے کہا تھا ''اگر ہوتیں، ایک دینا تو کوئی بات نہیں۔''

میں سکتے میں آ گیا۔

''لیکن جناب عزت۔'' میں نے کہا، ''اس کی بیٹی کے ساتھ میں شادی کر رہا ہوں، والد نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی غلط فہمی......''

''یہ معاملہ تم خود سلجھا سکتے ہو۔ ہم کل ان کے گھر جائیں گے۔ تیار رہنا۔ میں سات بجے کریٹن کے کیفے میں ملوں گا۔''

ہم اگلی شام ملے۔ میں بہت خوش تھا۔ میں نے ڈاڑھی منڈوائی، بال پیچھے کی طرف بنائے۔ میرا دل امید اور جوش کی وجہ سے قابو سے باہر ہو رہا تھا۔ ہم گرد سے بھرے راستوں پر چل پڑے۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ چاندنی نہیں تھی۔ آسمان سیاہ بادلوں سے بھرا ہوا تھا اور تیز ہوا چل رہی تھی۔ ہم تنگ، بل کھاتی ہوئی گلیوں میں سے گزرتے، ان پر کھلتی کھڑکیوں کے سامنے سے، قہقہوں، گراموفونوں کے شور، شرابی چیخ وپکار اور چوکیدار کی سیٹیوں کو سنتے ہوئے محبوبہ کے صحن میں پہنچ گئے۔ وہ صحن کے بیچ بازو ہاتھوں میں مضبوطی کے ساتھ تہہ کیے کھڑی تھی۔ وہ ہمیں اندر لے گئی۔ ہم صحن میں داخل ہوئے۔ چھوٹا سا صحن چھوٹی چھوٹی بدبودار چھپڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ جب ہم کرائے کے کمروں کے سامنے سے گزرے، ہمیں متجسس سائے نظر آئے اور سرگوشیاں سنیں۔ رہائشیوں کو یقیناً علم تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

میرے متوقع سسر نے بغیر دانتوں کی مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ ہم ان کے دروازے کے اندر چار سیڑھیاں چڑھے۔ ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں گئے جو بہت صاف تھا اور جس کی دیواریں برف کی طرح سفید تھیں۔ بہت ہی صاف شیشے والی لالٹین کمرے کو روشن رکھے ہوئے تھی۔ گلو اور اس کا خاوند اہم جگہوں پر کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ہم سے پہلے پہنچ گئے تھے۔ گلو لگاتار ہنسے جا رہی تھی۔

میرا متوقع سسر تمام عرصہ مجھے غور سے دیکھتا رہا۔ اس نے والد، پارٹی اور والد کی تقریروں کے بارے میں باتیں کیں۔ میں ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا، خصوصاً بیروت اور انوطولیہ کی۔

میری محبوبہ نے اٹھ کر ہمارے لیے کوفی بنائی۔ پھر گھبراہٹ میں وہ پھسل گئی اور کوفی فرش پر گر گئی۔ وہ شرمندگی میں کمرے سے بھاگ کر نکل گئی۔ بہر حال، کسی نہ کسی طرح وقت گزرتا

گیا۔ ہم نے تازہ تازہ بنائی کوفی پی، اپنے اپنے سگریٹ پیئے اور جب سب کچھ ہو چکا تو کمرے میں سگریٹوں کا دھواں رہ گیا۔ تب ہم اپنے اہم مسئلے کی صرف آئے۔ میرا متوقع سسر سنجیدہ ہو گیا اور اس طرح کے فقرے، ''اس جیسے عظیم باپ کا بیٹا......''

''ایک منٹ!'' میں نے ٹوکا۔

ہر کوئی میری طرف دیکھنے لگا۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ میں کیا کہنے والا ہوں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے! میں نے ایسی حیران کن اور دردناک کہانی سنائی جس میں ہر چیز، چوبیس لیرا اور پچانوے کروس تک شامل تھے کہ میرے سسر نے چھلانگ لگائی اور میرے ماتھے کو چوم لیا۔

''خدا تمھاری حفاظت کرے، میرے بیٹے۔'' اس نے کہا ''تم میری دعاؤں کے ساتھ میری بیٹی لے سکتے ہو۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ اسے اٹھاؤ اور لے جاؤ۔''

تو اب یہ ہو گیا۔ میرے پاس گھوڑا تھا اور تین نعل، جہاں تک چوتھے کا سوال تھا......

کچھ اس کے بارے میں بھی سوچا جائے گا!

(XXII)

میری دادی کیسے مانی؟

مجھے کوئی اندازہ نہیں۔

وہ مان گئی۔ میں نے اسے ان کے گھر جانے کا راستہ سمجھایا۔ وہ گئی اور اس نے لڑکی کو دیکھا۔

''کیا خیال ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''قابلِ قبول۔'' اس نے کہا ''وہ کالے رنگ کی پتلون پہنے کپڑے دھو رہی تھی۔ وہ محنتی، خوب صورت اور گھریلو لگتی ہے۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتی......''

ہم نے سادہ، پریشان کن منگنی کی (پریشان کن کیوں کہ ہم نے تانبے کی انگوٹھیاں پہنیں) اور بعد میں ہم نے شادی کی رسم پوری کی۔

(XXIII)

حسن حسین اُس دن پہننے کے لیے میرے لیے ایک نیوی سوٹ ادھار لایا۔ غازی نے نیا اُسترا حاصل کیا اور پے ٹینٹ چمڑے کے بوٹ اور ٹائی ادھار لی۔ میری شادی ہو رہی تھی اور میرے پاس پینتالیس کروس، دیہاتی سگریٹوں کی آدھی ڈبیہ اور اٹھارہ کروس کے ٹوکن تھے۔

آزادی زندہ باد۔

''حسن حسین۔'' غازی نے کہا، ''میرے پاس ڈیڑھ لیرا ہے۔ تمھارے پاس؟''

''میرے پاس؟ پینتیس کروس۔''

''اور جناب دولہا، آپ کے پاس؟''

''پینتالیس کروس......''

''میں سب سے امیر ہوں، غور کرو دوست، میرے پاس ایک سو پچاس ہیں، حسن کے پاس پینتیس، یہ ہو گئے ایک سو پچاسی، تمہارے پاس پینتالیس ہیں۔ تم اکاؤنٹنٹ ہو۔ کل کتنے ہو گئے؟

''دو سو اور تیس؟ رکو۔ پینتالیس بھول جاؤ۔ اس احمق کی بیوی آ رہی ہے۔ اسے بھی ضرورت ہوگی۔ دو سو تیس میں سے پینتالیس نکال دو تو؟''

''ایک سو پچاسی۔''

''ایک سو اور پچاسی۔ معلوم ہے کہ اب ہم کیا کریں گے؟ ہم کریٹن کے کیفے میں جا رہے

ہیں اور ہم اس احمق کی شان میں پی کر دُھت ہو جائیں گے کیوں کہ بھرنے کے لیے ایک اور پیٹ لا رہا ہے!''

''غازی!'' حسن حسین نے کہا، ''تم کبھی کبھی مکمل جینئس والی بات کرتے ہو۔''

ہم کرِیٹن کے شراب خانے میں چلے گئے، جہاں (تب 1937ء میں) وائین کے ایک گلاس کی قیمت پانچ کروس تھی۔ ہر ایک نے بیرل میں سے اپنے اپنے گلاس بھرے۔ غازی نے اپنا گلاس اوپر کیا

''اس احمق کے نام جو کھلانے کے لیے آج رات ایک فالتو پیٹ لا رہا ہے!''

ہم نے اپنے گلاس ٹکرائے اور ایک ہی ڈیک میں ختم کر دیے۔

''کیا بات ہے!'' حسن حسین نے کہا ''اپنی طرف تو دیکھو! نیوی سوٹ، پے ٹینٹ چمڑے کے جوتے، قمیص اور ٹائی...... تم ایک شریف آدمی لگ رہے ہو۔ بہت سمارٹ میرے دوست۔ ادھر دیکھو دوست، میں نہیں چاہوں گا کہ تم بیوی کے سامنے شیخی بگھارو۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں وہاں پہنچ جاؤں گا اور اسے بتا دوں گا کہ سوٹ اور جوتے مانگے کے ہیں۔ اسے اپنی بڑائی مت جتلانا۔''

''پریشانی کی ضرورت نہیں دوست!'' میں نے کہا، ''وہ مجھے پہلے ہی جان چکی ہے۔''

''اچھا؟''

''میں نے اسے اپنے چوبیس لیرا اور پچانوے کوروس اور باقی سب کے بارے میں بتا دیا ہوا ہے......''

غازی نے مجھے گلے لگا کر گال پر چوما۔

''پریشان مت ہو، دوست۔'' اس نے کہا، ''یہ سب جلد بہت پیچھے رہ جائے گا۔ ایک دن ہم اپنے بچوں کو بتائیں گے کہ ہم کتنے عظیم آدمی تھے۔''

ہم نے اس کا جام پیا، اس کا جام پیا اور نشے میں دھت ہو گئے۔ ہم دھوئیں کی وجہ سے شراب خانے کے دوسری طرف نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہمارے قہقہے ہوا کو کاٹتے ہوئے پٹاخوں کی طرح پھٹ رہے تھے۔ پھر بوڑھا وائین کا تاجر بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی بڑی ناک سرخ ہو گئی اور آنکھیں سوج گئیں۔ جیسے ہی اس نے جام تجویز کرنے کے لیے

گلاس اٹھایا، اس کی بیوی کمرے میں آ گئی۔ اس کی مٹھیاں مضبوطی کے ساتھ کولہوں پر تھیں۔

''خوب، خوب، خوب!'' اس نے کہا، ''تم بھی یہاں ہو۔ گاہک سروس کے انتظار میں ہیں اور تم یہاں ان لڑکوں کے ساتھ پی رہے ہو۔ تم کو شرم آنی چاہیے۔ اپنی عمر......''

بھاری، بوڑھے آدمی نے، اُس غارت گردن کے، پینتیس برس پہلے والے دِن کے لیے جام کے لیے گلاس اٹھایا۔

''ہُر!!!!!!'' وہ چیخا۔ ''خوش رہو نوجوانو!''

ہم نے ساڑھے چھ گلاس فی کس پیے۔ انھوں نے اپنا آدھا آدھا گلاس مجھے دے دیا۔ اس طرح میں نے سات گلاس پیئے۔

ہم وہاں سے اکٹھے نکلے اور وہ مجھے گھر لے آئے۔

میری پیاری مجھے دروازے پر ملی۔ وہ اچھے کپڑوں میں تھی...... گل کاری، گوٹے اور ستاروں والے، میرا سر چکرا رہا تھا۔ موسیقی چل رہی تھی اور عورتیں، لڑکیاں اور بچے تیز تیز چکر کاٹ رہے تھے۔ میری طبیعت خراب ہو گئی......

وہ مجھے جلدی سے اس دن کے لیے تیار کیے گئے کمرے میں لے گئے۔ کرسیاں، تخت، قالین بچھی ہوئی دیواریں اور دیواروں پر لٹکتے ہوئے رنگین لباس۔ یہ سب اُن پچاس میں جو میں نے فیکٹری سے پیشگی لیے تھے، ممکن نہیں تھا۔

میں ایک کرسی پر گر گیا۔

''ابھی مجھے شادی کے تحفے ملنے والے ہیں۔'' میری محبوبہ نے کہا، ''تم سنتے رہنا، دیکھو، یہ قالین، لباس......سب ہمارے ہیں۔''

''ہوں!''

انھوں نے میری محبوبہ کو بلا لیا، وہ چلی گئی۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سب کیسے ہوا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک بوڑھی عورت کی آواز آئی، بلند اور واضح۔

''سونے کا ایک خوب صورت کنگن، لڑکے کے باپ کی طرف سے۔ اچھے وقت پہننا''

''اس کی ماں کی طرف سے، گلے کا ہار۔ خوش نصیبی لائے!''

''چوڑیوں کا جوڑا!''

''ہیرے کے بُندے!''

''......!''

''......!''

''......!''

میرے لیے ایک جگہ توجہ مرکوز رکھنا مشکل ہو رہا تھا لیکن مجھے اتنا معلوم تھا کہ ہمارے لیے ایک چھوٹا سا خزانہ اکٹھا کیا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ والد، والدہ، ہمارے رشتہ دار...... میں بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش میں آیا تو محبوبہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ کوئی میرے سر کے اندر ہتھوڑے چلا رہا تھا۔

''دیکھو!'' اس نے کہا ''یہ سب مجھے پہنایا گیا ہے۔ یہ کنگن، چوڑیاں، انھیں دیکھو۔ اور یہ گلے کا ہار! یہ بُندے کیسے ہیں؟ ان میں ہیرے لگے ہوئے ہیں۔ ان کی قیمت پانچ یا چھ ہزار لیرا ہو گی۔ گلو کہتی ہے......''

''گلو کیا کہتی ہے؟''

''وہ کہتی ہے اس میں سے کچھ ہمیں بیچ دینا چاہیے، جس سے ہمارے پاس کچھ سرمایہ اکٹھا ہو جائے گا جو تمھارے کاروبار شروع کرنے کے لیے ضروری ہو گا۔ وہ ٹھیک کہتی ہے۔ ہمیں دوسرے لوگوں کا دست نگر نہیں ہونا پڑے گا۔''

''ہاں، میں ایک ریستوران کھول لوں گا...... یا شاید......''

''تم کیفے شروع کر سکتے ہو یا ایک پنساری کی دکان۔ مجھے بُندے بہت پسند ہیں۔''

''یہ تمام تحفے؟''

''تمھارے رشتہ دار بہت مہربان تھے۔ تم مجھے بتاتے رہتے تھے کہ......''

''میرا خیال ہے کہ میں سمجھ نہیں سکا ہوں گا......''

''یہ افغانی دری دیکھو! اور یہ قالین؟''

''لباس کا میٹریل بھی؟''

''ہاں! اور وہ تمام لباس بھی۔ اب کئی سال مجھے نئے لباس کی ضرورت نہیں ہو گی۔''

''ہم کافی فائدے میں رہ گئے؟''

''ہم فائدے میں تو رہ گئے لیکن جو بھی کہو ہم نے خرچ کرنے کی طرف مائل نہیں ہونا۔ ٹھیک؟ اور تم وائین پینا بھی بند کر دو۔ میں بھی بیکار نہیں بیٹھوں گی۔ ہم قسطوں پر کپڑے سینے کی مشین خرید لیں گے۔ میں کپڑے سینا سیکھ لوں گی اور درزن کا کام کر کے کچھ پیسے کما لیا کروں گی۔''

اگلے دن میں نے آنکھیں کھولیں تو میری محبوبہ آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ میں آہستگی سے بستر پر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ وہ بالوں میں کنگھی کر کے انھیں موڑ دیتے ہوئے کلپ میں لگا رہی تھی۔ پھر اس نے لپ سٹک لگائی اور چہرے پر پاؤڈر لگایا۔ اس نے بُندے اٹھا کر چومے اور پہن لیے۔ اس نے کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف مڑتے ہوئے اپنے آپ کو تحسین کے ساتھ دیکھا۔ پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ اس نے چیخ کر اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور بالکل میرے پاس پلنگ پر گر گئی۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا۔

''کیا بات ہے؟ شرما گئیں؟''

وہ کانوں تک سرخ ہو گئی تھی۔

''بتاؤ، شرما گئیں؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ میری طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔

''جانتے ہو'' اس نے تھوڑی دیر کے بعد اپنی بڑی، سیاہ آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا ''یہ بُندے مجھے بہت پیارے ہیں۔ انھیں ہم آخر میں بیچیں گے یا بیچیں گے ہی نہیں!''

''ٹھیک ہے...... ہم انھیں بیچیں گے ہی نہیں۔''

''سب سے پہلے ہم چوڑیاں بیچیں گے، پھر ہار اور بعد میں...... جانتے ہو میں کیا کرنے والی ہوں؟ میں سرخی لگاؤں گی، چہرے پر پاؤڈر لگاؤں گی، تمام گہنے پہنوں گی، میں بالکل مکمل بنوں گی اور پھر تمھیں بازو سے پکڑ کر ارد گرد کا چکر لگاؤں گی۔ جب مجھے ایسے دیکھیں گی تو شرطیہ میری تمام دوست حسد سے جل جائیں گی۔ کیا خیال ہے؟''

’’یقیناً......‘‘

’’انھیں حسد کرنے دو۔ کسبیاں! میری شادی پر نہیں آئیں۔ گلو کہتی ہے کہ سب کچھ پہن کر انھیں دکھاؤ۔ وہ کہتی ہے کہ کسبیوں کو جل مرنے دو۔ کیا ہم ایک تصویر بنوا سکتے ہیں؟ ہم اسے میرے چچا کو بھیجیں گے۔ یہ بُندے دیکھو گے؟ اتنے خوب صورت ہیں! مجھ پر بہت سجتے ہیں۔ ہیں نا؟‘‘

’’تم پر سب کچھ سجتا ہے، میری حسینہ!‘‘

دو دنوں کے بعد دادی مجھے ایک طرف لے گئی۔

’’بیٹا۔‘‘ اس نے کہا، ’’یہی ہماری خاندانی روایت ہے اور مجھے تمھارے باپ کی خاطر دکھاوے کے لیے اسے قائم رکھنا تھا۔ مناسب طریقے سے اپنی بیوی کو بتا دینا......‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘

جو چیزیں میں نے ادھار میں لی تھیں......‘‘

’’کون سی چیزیں؟‘‘

’’سونے کے تمام زیور، کنگن، کانٹے، چوڑیاں، ہار......‘‘

’’کیا......؟‘‘

’’ہمیں واپس کرنے ہیں۔‘‘

’’کیا......تم نے سب ادھار لیا؟ یہ سب دوسرے لوگوں کی ملکیت ہے؟‘‘

’’کیا کرتی؟ دکھاوا بھی کوئی چیز ہے......‘‘

مجھے لگا کہ کسی نے مجھے گولی ماردی ہے۔

’’تم پر اور تمھاری روایت پر لعنت۔‘‘ میں نے کہا، ’’تم سب کو، تو...... تمھیں شادی کے تحفے واپس چاہئیں۔ اس سے مانگو۔ اپنا گندا کام خود ہی کرو۔ میں جتنا گھٹیا ہو سکتا تھا ہو گیا ہوں، صرف تم لوگوں کی وجہ سے۔ میں یہ نہیں کروں گا۔‘‘

میں باہر چلا گیا۔

اس رات سیڑھیوں کے اوپر میری بیوی میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ زیور نہیں پہنے ہوئے

تھی۔ نہ کانٹے، نہ ہار، نہ چوڑیاں۔ ہم اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ہم ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔

’’میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔‘‘ تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا ’’لیکن تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وعدہ کرو کہ تم ناراض یا پریشان نہیں ہو گے؟‘‘

میں نے ظاہر کیا کہ سمجھ رہا ہوں۔

’’کیوں؟! کیا بات ہے؟‘‘

’’وعدہ کرو کہ پریشان نہیں ہو گے؟‘‘

’’ٹھیک ہے...... مجھے بتا دو...... میں ٹھیک رہوں گا......‘‘

’’کہو ایسا کچھ ہے جو تمھیں نظر نہیں آ رہا؟‘‘

’’مثلاً؟‘‘

’’میرے کان دیکھو!‘‘

’’اوہ، ہاں، تمھارے کانٹے کہاں ہیں؟‘‘

اس نے اپنے بازو میری گردن کے گرد ڈال دیے۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

’’ناراض نہیں ہونا، پریشان نہیں ہونا، ہم ابھی جوان ہیں۔ ہم محنت کریں گے، ہم پیسے کمائیں گے۔ ہم اپنے بل بوتے پر اٹھیں گے۔ ایسا بھی نہیں کہ ہم ہیرے والے بُندوں کے ساتھ پیدا ہوئے تھے۔‘‘

’’تم نے ابھی تک نہیں بتایا کہ ہوا کیا ہے؟‘‘

’’تمھاری دادی نے ہر شے واپس لے لی۔ اس نے سب کچھ رشتے داروں اور پڑوسیوں سے ادھار مانگا ہوا تھا، صرف دکھاوے کے لیے۔ سب چیزیں مالکوں کو واپس بھی تو کرنا تھیں۔ یہ ہے بھی درست۔ میرا مطلب ہے کہ واپس کرنا ضروری تھا۔‘‘

میں نے اس کے بازوؤں کو اوپر سے بھینچا اور چوما۔ گیلی آنکھوں کے پیچھے سے وہ بہادری کے ساتھ مسکرانے کی کوشش میں تھی۔

"تم پریشان تو نہیں؟ مجھے بتاؤ!"

"نہیں، میں پریشان نہیں۔"

"بعد میں بھی پریشان نہیں ہو گے؟"

"نہیں، وعدہ کرتا ہوں۔"

بعد میں، ایک ایک کر کے، پلنگ، تمام لباس، کپڑے، قالین، میرا نیوی سوٹ، ٹائی، جوتے، ہر چیز اصل مالکوں کے پاس چلی گئی۔ میری بیوی اس سچ پر کہ جو کپڑے میں نے پہنے ہوئے تھے وہ بھی کسی کے تھے، دل کھول کر ہنسی۔

"مگر ڈرالنگ، پریشان نہیں ہونا۔" اس نے کہا "ہمارے پاس زیادہ تو نہیں لیکن ہم ایک دوسرے کے تو ہیں۔"

چنانچہ ہم اپنی زندگی چلاتے رہے، جو ہمارے پاس تھا اس کی قدر کرتے ہوئے!

(ختم شد)

1949ء

نوٹ

ہمارے ادارے کی یہ کوشش ہے کہ ترجمے کی اشاعت میں جہاں تک ممکن ہو تحریر کی رُوح کو متاثر نہ ہونے دیا جائے۔ بعض اوقات ترجمہ Original تحریر سے بھی زیادہ مشکل ہو جاتا ہے، اس کی وجہ ہر تہذیب و ثقافت کے اپنے پیمانے ہوتے ہیں، اس کے علاوہ کچھ الفاظ / نام Original زبان میں کسی اور طرح بیان کئے جاتے ہیں مگر اردو بولنے، لکھنے اور پڑھنے والوں کے لیے اُن کا بیان سراسر مختلف ہوتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب کے مصنف (اورحان کمال) کمال اتاترک کے انقلاب کے بعد ترکی کے ادبی میدان میں ابھرے۔ یہ وہ دور تھا جب ترکی جدیدیت کے حوالے سے مختلف اصلاحات بھی کر رہا تھا۔ جس میں ترک زبان کی اصلاحات بھی کی گئیں جس کے بعد اس زبان میں کئی بنیادی تبدیلیاں رونما ہوئیں، ترکی زبان میں "خ" کو متروک کر دیا گیا اور اس کی جگہ صرف "ح" کا استعمال طے ہوا، جیسے خالدہ ادیب خانم جدید ترک زبان میں حالدہ ادیب حانم Pronunciation کی جاتی ہیں، ایسے ہی اورحان کمال درحقیقت اورخان کمال بیان کیا جاتا تھا لیکن جدید ترکی میں اب اس نام کو اورحان ہی پکارا جاتا ہے۔ ہمارے ادارے کے ایڈیٹوریل بورڈ نے اس مسئلے پر جدید ترکی زبان کے متعدد ماہرین سے مشورے کے بعد اس فیصلے پر اتفاق کیا ہے کہ جدید ترکی میں رائج، ترک زبان جو کہ رائج الوقت ہے، کو اپنایا جائے۔ لہٰذا زیرِ نظر کتاب کے مصنف کا نام اورحان کمال رائج الوقت بھی اور منطقی طور پر درست بھی ہے۔

(ادارہ)